

مهر النساء

از

نیر احمد



مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ پروانہ ہم دونوں میں سے کون تھا؟ شاید میں تھا یا پھر شاید مومو بھی۔

مومو کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ مہرا نساء ہو کر تھی اور مہرا نساء وہ اپنی پیدائش کے فقط دو ماہ بعد تک رہی تھی۔ اس کے بعد وہ مومو بن گئی تھی اور پھر میں نے اسے مہرا نساء بھی پکارا ہی نہیں بلکہ میں نے تو اسے کبھی بھی نہیں پکارا۔ اسی لیے اس کو مہرا نساء کہتے ہوئے مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔ یہ طرزِ خطاب بہت اجنبی سا ہے بلکہ اب تو مومو بھی اتنی ہی اجنبی ہے جتنا یہ نام۔

مومو کے کان میں اذان میں نے دی تھی۔ اس کو پہلا بوسہ بھی میں نے دیا تھا۔ اس کو نرس کے کھدوے ہاتھوں کے ٹکے سے اپنے بازوؤں میں سب سے پہلے میں نے ہی اٹھایا تھا۔ میری جگہ اس وقت حیدر کو ہونا چاہیے تھا کیونکہ مومو اس کی بیٹی تھی۔ مگر حیدر کے بہت سے مسائل تھے۔ وہ ہفتے پہلے ایک اکنامک فورم میں شرکت کرنے کے لیے کینڈا گیا تھا۔ اسے مومو کی پیدائش سے پچھلے روز ہی آجانا تھا مگر برف باری کے باعث فلائیں ملتوی ہو گئیں اور وہ وہیں پھنس گیا۔ اپنی جگہ وہ بھی بہت زچا تھا کیونکہ مومو اس کی پہلی اولاد تھی۔

حیدر کے کزن اور بہترین دوست ہونے کی حیثیت سے آنٹی نے مجھے فون کر کے بلوایا تھا۔

”حسان! مجھے اس وقت حیدر کی ضرورت ہے اور وہ نہیں ہے، مگر تم بھی میرے لیے حیدر کی ہی طرح ہو۔“ وہ پریشان تھیں اسی لیے اپنا پہلا جاب انٹرویو بھلا کر میں دوڑا چلا آیا اور پھر تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

جب نرس نے حیدر کی نومولود کبیل میں لپٹی بیٹی میرے حوالے کی تو ایک مسرت بخش احساس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں نے جھک کر بچی کو پار کیا اور پھر ہسپتال کے سفید اور گرے ماربل سے بنے کارڈیور کے دوسرے سرے پر کھڑی آنٹی کے پاس اسے لے آیا۔

”آنٹی! یہ حیدر کی بیٹی ہے۔“ اس سوئی ہوئی بچی کو میں نے آنٹی کی گود میں ڈال دیا انہوں نے والہانہ انداز میں بچی کا ہاتھ جوام۔ مگر یکدم سر اٹھا کر مجھے دیکھا ان کی خوشی سے تھمتانے چہرے تفلر کی لکیریں ابھری تھیں۔

”سونیا کیسی ہے حسان؟“

میں نے ایک گہری سانس لی، ”وہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

میرا مطلب تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ آنٹی پریشانی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں نے انہیں تسلی دینے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ میری پشت پر کسی نے کہا۔

”سونیا کے ہرینڈ کون ہیں؟“ میں چونک کر پلٹا۔ میرے سامنے سفید اور آل میں لمبوس، سپاٹ چہرے والی لیڈی ڈاکٹر کھڑی تھیں۔

”وہ یہاں نہیں ہیں، سونیا کیسی ہے؟“ میرے لمبے میں بے قراری تھی۔

”سوری، وہ بچ نہیں سکیں۔“ انہوں نے بتایا اور میں اپنی جگہ سُن سا ہو کر کھڑا رہ گیا۔

آنٹی بے اختیار اپنی من چاہی ہو کے لیے رونے لگی تھیں، میں نے ایک ترحم آمیز نگاہ ان کی بانہوں میں سکون سے سوئی بچی پر ڈالی۔ مجھے اس پر بے حد ترس آیا تھا۔ کسی بچے سے اس کی ماں چھن جائے اس کا اندازہ مجھ سے بہتر کون کر سکتا تھا؟ میری ماں بھی تین برس کی عمر میں مجھ سے دور چلی گئی تھی، فرق یہ تھا کہ مومو کی ماں کو اللہ نے اس سے دور کر دیا تھا اور میری ماں کو ایک مرد نے، یعنی ان کے دوسرے شوہر نے اس کے بعد مجھے کسی عورت کی محبت نہیں مل سکی تھی، میرے اندر اس بات سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا، میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مومو کے اندر بھی پیدا ہو کر میں کیا کر سکتا تھا۔

حیدر بمشکل جنازے پر پہنچ سکا تھا۔ اس کی حالت بہت بری تھی۔ اس کی اور سونیا کی لومیرج تھی یہ بات مجھے اور بھی دکھی کر گئی۔

حیدر کو اپنا ہوش نہیں تھا، آنٹی تعزیت کے لیے آنے والوں کو بھٹکات رہی تھیں، کسی اور کی مدد نہ حاصل ہونے کے باعث میں اکیلا باہر کے بہت سے کام نٹا رہا تھا، ایسے میں کسی کو بھی اس ایک دن کی بچی کا خیال نہ آیا، جو بہت نہیں کہاں تھی۔

اس وقت بھی میں اپنی نگرانی میں مائی حلیمہ سے کچن سے برتن نکلا رہا تھا جب دفعنا ”ایک چھوٹے بچے کے رونے کی آواز نے مجھے چونکایا۔“ یہ کون رو رہا ہے؟“

”کوئی مہمانوں کا بچہ ہو گا۔“ حلیمہ نے پلیٹیں نکالنے ہوئے مصروف انداز میں کہا۔

میں یکدم بے چین سا ہو گیا۔ وہ بچہ مسلسل رو رہا تھا۔ حلیمہ کو کچن میں چھوڑ کر میں آواز کے تعاقب میں باہر

گیا۔ رونے کی آواز پینٹری کے ساتھ بنے اسٹور روم سے آرہی تھی۔ میں اسٹور روم کا نیمہ دروازہ پورا کھول کر جیسے ہی اندر داخل ہوا، سامنے سلور کی ایک چٹنی پر کبیل میں لپٹی حیدر کی روٹی بیٹی مجھے دکھائی دی تھی۔

دکھ حیرت اور غصے سے میرا برا حال تھا۔ میں نے بچی کو اٹھا کر تھپکا، مگر وہ روٹی رہی۔ میں نے اس کو باہر جا کر آنٹی کے حوالے کیا اور نوکروں کو ایک یادگار ڈانٹ پلا کر بچی کی نگہداشت پر لگا دیا۔ پتہ نہیں وہ کب سے بھوکی تھی۔

اس رات حیدر کو پہلی دفعہ اس کی بیٹی دکھائی گئی۔ حیدر نے کسی فلمی باپ کی طرح بیوی کی موت کا ذمہ دار بیٹی کو ٹھہرا کر قبول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا، بلکہ اس کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

سونیا کی ڈیوٹ کے چھتے دن جب میں حیدر کی طرف گیا تو آنٹی نے مجھ سے پوچھا۔

”حسان! حیدر کی بیٹی کا نام کیا رکھیں؟“

ان کے سامنے کرسی پر بیٹھے بغیر سوچے سمجھے میرے لبوں سے ”مہرا نساء“ نکلا تھا۔

”مہرا نساء۔“ شاید آنٹی کو نام بیکورڈ لگا تھا۔

”اس بچی کو محبت کی ضرورت ہے آنٹی اور مہر کا تو مطلب ہی محبت ہوتا ہے۔“ میں یونسی کہتا چلا گیا۔

”ہوں ٹھیک ہے۔ یہ نام بالکل ٹھیک ہے۔ حیدر سے میں نے پوچھا تو وہ ”آپ کی مرضی“ کہہ کر لا تعلق ہو گیا، پتہ نہیں اس نے اور سونیا نے اپنے بچے کے لیے کتنے نام سوچے ہوں گے۔“ وہ یکدم افسردہ نظر آنے لگیں۔

”خوصلہ کریں آنٹی!“ ایک دم بہت زیادہ تنہا ہو جانے والی آنٹی کو تسلی دینے لگا، اور پھر محسوس طریقے سے میرا حیدر کے گھر آنٹی کی دلجوئی کے لیے آنا چاہتا بڑھتا گیا۔

وہ حیدر کے لیے بہت پریشان رہتی تھیں، حیدر نے خود کو ہرنے سے الگ تھلگ کر لیا تھا۔ اس کا زیادہ وقت اب اس کے کام میں گزرتا تھا۔ کبھی کبھار وہ مجھے سگریٹ پیتا بھی دکھائی دیتا، حالانکہ سونیا کی ڈیوٹ سے پہلے وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا۔

”مت کیا کرنا سموکنگ نقصان دے گی۔“ ایک دن جب وہ لان میں ٹہلتے ہوئے سگریٹ پھونک رہا تھا تو میں نے اسے نوکادہ چھبیس سال کا تھا، مجھ سے چار برس بڑا، مگر تار، بے تکلفی، بلا کی تھی۔

”بھئی میں تمہیں منع کرتا تھا اور اب تم مجھے۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”کیا فرق پڑتا ہے؟“

”فرق پڑتا ہے حیدر! تم آنٹی اور مہر کو وقت نہیں دے رہے ہو۔ ان دونوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ اگر تم یونسی سگریٹوں کی طرح خود کو پھونکتے رہو گے تو نارمل لائف کی جانب آنا تمہارے لیے مشکل ہو جائے گا۔“

میرے سمجھانے پر اس نے اثبات میں سر ہلادیا لیکن مجھے علم تھا، وہ میری بات نہیں مانے گا۔ مومو اور حیدر میری زندگی کی کہانی کے وہ کردار تھے جنہیں کبھی میری بات نہیں مانتا تھی۔

میری زندگی میں ایک اور کردار میرے ابو تھے جن کا وہ برس پہلے انتقال ہوا تھا۔ بہن بھائی تھے نہیں، میں اکیلا رہتا تھا۔ ان دنوں نوکری تلاش کر رہا تھا۔ زندگی کے بارے میں میرے پانچ واضح تھے، ایک زبردست قسم کی جاب ڈھونڈ کر چار پانچ برس خود کو فنانسلسی اسٹراٹج کرنا اور پھر کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر کے ہنسی خوشی رہنا۔

زیادہ مسائل میرے ہوتے نہیں تھے، سو روز شام اپنے گھر سے دس منٹ کی داک پر موجود حیدر کے گھر جا کر آنٹی کے ساتھ ایک کپ چائے پینے کا وقت خود بخود نکل آتا تھا۔

اسی طرح کی ایک عام سی شام جب میں آنٹی کی طرف آیا تو وہ لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھی، اپنی پوتی کے منہ میں چھوٹے سے پالی ڈال رہی تھیں۔

”کسے ہو حسان!“ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر ایک مہینہ جھمک گیا۔

”ٹھیک ہوں آپ کیسی ہیں؟“

”میں تو بس مہر کی جانب سے پریشان ہوں۔“ اپنی گود

نمران ڈائجسٹ کا ایک حیرت انگیز سلسلہ

ایئر سوسائٹس

اب دو حصوں میں شائع ہو گئی ہے۔

مکوانے کا پتہ:

مکتبہ نمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 2216361

میں لپٹی مہر چٹکی وہ تشویش سے کہنے لگیں۔ ”رات سے اتنا تیز بخار ہے۔ اب میری لپٹی سیدھی طبی امداد سے شکر ہے کچھ کم ہوا ہے، ورنہ اتنے چھوٹے بچے کی تو کوئی دوائی بھی نہیں ہوتی۔“

”ارے اتنی باری سی بچی کو کیوں بکار چڑھ گیا؟“ میں اٹھ کر مہر کے قریب آگیا اور پیار سے اس کا گال چھوا۔ وہ اپنی دواؤں کو دیکھ رہی تھی۔

”مہراوے گندی بچی، ادھر دیکھو۔“ میرے پکارنے پر بھی وہ دواؤں کو ہی دیکھتی رہی۔ اس نے پنگ کلر سے فراک کے ساتھ ہم رنگ ادلی جرابیں پہن رکھی تھیں۔

”مہرا ادھر دیکھو۔“ میں نے اسے متوجہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

”مہر گندی بچی مومو۔“ غیر ارادی طور پر میرے لبوں سے مومو نکلا، اس نے ایک دم اپنی بڑی بڑی براؤن آنکھیں گھما کر مجھے دیکھا۔

مومو دراصل اس ناول کی ہیروئن کا نام تھا، جو میں پچھلی رات پڑھ رہا تھا۔ مہر کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ہی میرے لبوں سے وہ نکلا اور اس دن سے اس کا ننگ نیم بن گیا۔ پھر ہم نے اسے کبھی مہر نہیں پکارا۔

وہ بہت پیاری بچی تھی، اس میں حیدر کی بہت شباهت تھی، خصوصاً اس کے اوپر والے ہونٹ کا کٹاؤ تو ہو ہو حیدر کی طرح تھا مگر بھوری آنکھیں اس نے سونیا کی جڑائی تھیں۔

جب مومو نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا تو اس کا مشغلہ مٹی کھانا بن گیا۔ آنٹی اس کے لیے دنیا بھر کے بہترین کھلونے لاتی تھیں، مگر مومو پھر بھی کسی مٹی کی طرح رینگ کر لاؤنج سے باہر نکل جاتی اور لان میں کیاری سے مٹی نکال نکال کر کھاتی۔ مجھے جب بھی وہ مٹی کھاتی دکھائی دیتی، میں اسے ڈانٹ دیتا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ منع تو نہیں ہوتی البتہ میری گاڑی پورچ میں داخل ہوتے دیکھ کر ہی وہ مٹی کھانا چھوڑ کر تیزی سے گھٹنوں پر چلتی ہوئی اندر دوپوش ہو جاتی۔ وہ مجھ سے ڈرنے لگی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اسے صرف ڈانٹتا ہوں، اسی لیے جب اس شام میں حیدر کی طرف آیا اور وہ مجھے فراک میں ملبوس کیاری میں بیٹھی نظر آئی تو میں نے قدرے نرمی سے اسے پکارا ”مومو!“

مٹی کھاتے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ یکدم رکے، اس نے گردن اٹھا کر قدرے فاصلے پر مجھے کھڑے دیکھا تو

اس کی مڑی ہوئی پلکوں والی بھوری آنکھوں میں یکدم بے تحاشا خوف سٹ آیا۔ مٹی چھوڑ کر تیزی سے لڑھکتی ہوئی وہ اندر کی جانب بھاگی تھی۔

میں بے اختیار ہنس پڑا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ آنٹی اندر ہی بیٹھی تھیں۔ میں نے اس کو جالیا۔

”آنٹی یہ مٹی کھا رہی تھی۔“

”ارے حسان آؤ بیٹا۔“ انہوں ایک نظر کاریٹ پر بیٹھی مومو پر ڈالی جواب ان کے صوفے کا بازو پکڑ کر کھڑی ہونے کی کوشش میں بار بار نیچے گر جاتی تھی۔

”بس اب میں کہاں بھاگ سکتی ہوں۔ اس کے پیچھے؟ ذرا ادھر ادھر ہوئی تو یہ باہر نکل جاتی ہے۔“ اس کا منہ دھلا کر لانے کے بعد آنٹی کہہ رہی تھیں۔

میں ہنس رہا پھر حیدر کے متعلق استفسار کیا۔

”حیدر کے پاس گھر کے لیے کوئی وقت نہیں ہے اس کا تمام وقت اپنے آفس کے لیے ہے۔ گھر آتا ہے تو کمرے میں بیٹھ کر آفیشل ورک کرتا رہتا ہے۔ اس نے تو ان تمام میٹروں میں مومو کی شکل بھی ٹھیک سے نہیں دیکھی۔“

انہوں نے گود میں بیٹھی مومو کی جانب تاسف سے دیکھتے ہوئے اس کے ماتھے پر آئے بھورے بال سنوارے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا حسان! میرے بعد میری مومو کا کیا بنے گا۔ میری مومو تو رُل جائے گی۔ ”ان کی نگاہوں اور نچے سے اضطراب چھٹک رہا تھا۔“

اس وقت تو میں نے آنٹی کو تسلی دے دی مگر اس رات مجھے آنٹی کی باتیں بہت یاد آئی تھیں۔

میں نے آپ کو بتایا تھا، میری مٹی مجھے تین برس کی عمر میں چھوڑ کر چلی گئی تھیں، ”ان کے دوسرے شو ہر جگہ نہیں رکھنا چاہتے تھے، سو میں ساری زندگی بابا کے ساتھ رہا۔“

کی محبت کی کمی نے میرے اندر جو خلش چھوڑی تھی وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خلا بن گئی تھی اور اسی خلا، اسی خلش اور ذات کے ان ہی اندھیروں پر ہی تو میں یہ کہانی آپ کو سن رہا ہوں۔ یہی بات تو میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں، مگر آپ کو ایسے سمجھ میں نہیں آئے گی۔ آپ جب تک میری کہانی پوری نہیں سن لیں گے آپ کو میری منطق، میری تھیوری سمجھ میں نہیں آئے گی۔

اپنی ماں کی جدائی کے بعد میری تھیوری یہ تھی کہ اس دنیا کی ہر عورت بے وفا ہوتی ہے۔ عورتیں ہمیشہ آخر میں چھوڑ جاتی ہیں، بے وفائی کر کے تھکا کر جاتی ہیں۔ آپ کو

میری بات بری لگے گی، جانتا ہوں، مگر آپ کو میری بات سمجھنے کے لیے میری پوری کہانی سننا پڑے گی۔

”کدھر ہوتے ہو تم حسان؟ اب تو حیدر کی طرح تمہارے پاس بھی ماں کو دینے کے لیے چند منٹ بھی نہیں ہیں۔“ مجھے دیکھتے ہی آنٹی نے بے حد شاکہ انداز میں کہا۔

”پورے چار مہینے بعد شکل دکھائی ہے اپنی!“

”سوری آنٹی! میں کراچی تھا، وہاں پر مسائل ہی اتنے تھے کہ پھنس کر رہ گیا۔“ ”ان کے اپنائیت بھرے شکوے نے مجھے شرمندہ کر دیا تھا۔“

مومو کا بڑی ہو چکی تھی، چلتی پھرتی نظر آ رہی تھی اور تو اور، اب وہ بولتی بھی تھی، البتہ مجھ سے ابھی تک ڈرتی تھی۔

اسے دیکھ کر میں نے ایک دوستانہ مسکراہٹ اچھال دی مگر وہ خاموشی سے اپنی بڑی، بھوری آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔

میں آنٹی سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ اتنے عرصے بعد مل رہا تھا، کچھ میں سن رہا تھا تو کچھ وہ بولتے بولتے میرا حلق خشک ہو گیا تو میں نے سوچا کہ ذرا بات مکمل کر کے پانی پی آؤں۔

”ماں!“ مومو کی آواز میری سماعت سے نکل گئی۔ میں نے رک کر بے حد چونکتے ہوئے اپنے دائیں جانب دیکھا،

مومو اپنے ننھے منے ہاتھوں میں پانی کا گلاس تھامے کھڑی تھی۔ مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔

”مومو! میں نے تو بتائی نہیں مانگا۔“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ اسے میرے لیے پانی لانے کو کس نے کہا تھا۔

”آپ کو پاش (پاس) لگی ہے؟“ وہ اپنی تو تلی زبان میں پوچھ رہی تھی۔ آنٹی سی بچی نے اندازہ کر لیا تھا کہ مجھے پاس لگی ہے اور وہ دوڑ کر میرے لیے پانی لے آئی تھی۔

میں سب سے حد شاکہ تھا۔

”تھینک یو مومو۔“ میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے توں لیا۔

”میری مومو بہت کیڑمگ ہے۔“ آنٹی نے پیار سے مگراتے ہوئے اسے دیکھا۔ ”جیسے ہی حیدر تھکا ہارا گھر آتا ہے، مومو فوراً اس کو پانی پلاتی ہے۔“

مجھ جیسے اپنے آپ سے واسطہ رکھنے والے بندے کو

ایک بہت چھوٹی لڑکی کا یہ خیال دیکھ کر بہت حیرت ہوئی تھی۔

مومو کچھ اور بڑی ہوئی تو آنٹی کو اسے اسکول میں ڈالنے کی فکر ہوئی۔

”آنٹی! ابھی تو وہ بمشکل ڈھائی سال کی ہوگی، ابھی اسے اسکول میں مت ڈالیں۔“

”حسان! میں چاہتی ہوں۔ مومو اپنی عمر سے ایک دو برس آگے اسٹڈیز کر لے۔ چلو ابھی اسکول میں نہیں ڈالتے مگر اسے گھر میں نرمی اور پیار پڑھا کر سال ڈیڑھ سال بعد ڈائریکٹ وین میں داخل کرا دیں گے۔“ وہ پہلے سے پلان کر کے بیٹھی تھیں۔ ”تمہیں نہیں پتہ، میری مومو بہت سمجھ دار ہے۔ اس کا ذہن اس کی عمر سے آگے ہے۔“

آنٹی کا مجھے قائل کرنے کے لیے کہا گیا وہ آخری فقرہ میرے ذہن کے پردوں سے چپک کر رہ گیا۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ جو بات میرے ذہن میں ایک دفعہ بیٹھ جاتی تھی وہ کبھی نہیں نکلتی تھی۔

اس روز میں چند کتابیں خریدنے مارکیٹ گیا۔ مطالعہ میرا شوق، میرا جنون تھا۔ کتابوں کے معاملے میں میں ہمیشہ سے اعلا ذوق اور کریزی رہا تھا۔ اس روز بھی چند اعلا قسم کی کتابیں خرید کر میں کاؤنٹر پر کھڑا بے منت کر رہا تھا جب دائیں جانب رکے ریک پر کئی چند کلرنگ بکس اور اردو انگریزی کے حروف تہجی کے قاعدوں نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کی۔

پہلا خیال میرے ذہن میں مومو کا آیا تھا، چنانچہ میں نے چند کتابیں خرید لیں۔

شام کو حیدر کی طرف گیا تو جانتے ہی کتابوں والا شاپر مومو کو گھمایا۔ ”یہ تمہاری ہیں۔“

وہ میرے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی اور شارپ سے باری باری تینوں بکس نکال کر دیکھنے لگی۔ اس کے ہاتھ چھوٹے چھوٹے تھے اور کتابیں بڑی اور موٹی تھیں۔

”تھینک یو۔“ پر ان کا کیا کروں؟ ”اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھتے ہوئے متانت سے پوچھا، اس کی بھوری آنکھوں میں بنا کی سنجیدگی تھی۔

”ان کو پڑھو۔“

”وہ کیسے؟“ اس نے مڑی ہوئی پلکیں اٹھا کر معصومیت سے مجھے دیکھا۔

”تم ہی پڑھاؤ نا، حسان!“ آنٹی جو کافی دیر سے ہماری ایکسیویٹی دیکھ رہی تھیں بول اٹھیں۔

”پڑھاؤں گا، اگر آپ کو میرا روز روز کا آبرا نہ لگے۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو حسان؟“ وہ برائیاں لگیں۔

”یہ تمہارا آبرا گھر ہے، غیروں کی طرح تکلف نہ کیا کرو اور اب تم روز آکر اس کو پڑھاؤ گے، اس عمر میں مجھ سے یہ پڑھانے والا کام نہیں ہوتا۔“ وہ پھر مومو کی جانب پلٹیں۔

مومو دونوں ہتھیلیاں چہرے کے گرد رکھے دچھی سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔

”اور مومو! اب یہ حسان انکل آج سے تمہارے سر پر ٹھیک ہے؟“

مومو نے فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلادیا۔

یوں اس روز سے میں مومو کا پیر بن گیا۔ اتنے چھوٹے بچے کو پڑھانے کے لیے بہت زیادہ قوت برداشت درکار ہوتی ہے مگر اپنی عمر سے آگے سوچنے والی سمجھ دار مومو کے ساتھ مجھے کوئی مسئلہ نہ ہوا۔

ہاں وہ سوال بہت کیا کرتی تھی۔

”سرا! ہم بڑے کیوں ہیں؟“

”سرا! آسمان بلو کیوں ہوتا ہے؟ گرین کیوں نہیں ہوتا؟“

”سرا! یہ پانی کا کوئی کڑ کیوں نہیں ہوتا؟“

”سرا! یہ دھاگہ کیسے بنتا ہے؟“

اور میں اس کے سوالوں کا جواب ہمیشہ تفصیل سے دیا کرتا تھا۔

”مومو! تمہیں پایا نام دیتے ہیں؟“ اس روز وہ اسٹڈی روم میں میرے سامنے برکھی کرسی پر بیٹھی اپنی کتاب کو ہمارے درمیان رکھی اونچی ٹیبل پر رکھے letters dotted پر پینسل پھیر رہی تھی جب یونی میں نے پوچھ لیا۔

”دادہ کتنی ہیں، پایا کے پاس نام نہیں ہوتا۔“ وہ چہرہ اٹھائے اور رکے بغیر بولی۔

”تمہیں برا تو لگتا ہو گا؟“ میں اس کی محرومیوں کی شدت سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

”نہیں۔“ اس نے شانے اچکائے۔ ”دادہ کتنی ہیں پایا ازاے بڑی مین!“ وہ اتنی سی عمر میں سمجھوتا کر چکی تھی۔

پھر ایک روز جب میں اسے مینٹس کے ہند سے لکھتا دکھا رہا تھا اس نے پینسل میز پر رکھتے ہوئے پوچھا ”سرا“

میری ماما بہت اچھی تھیں؟“

”ہاں، وہ بہت اچھی تھیں۔“

”پھر وہ مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئیں؟“

”بھئی، وہ مومو کو ہمارے پاس چھوڑ کر گئی ہیں۔“ میں نے اسے سہانا چاہا، مگر وہ شاکی نگاہوں سے مجھے دیکھ کر بولی

”مگر آپ تو ہر وقت ڈانٹتے رہتے ہیں۔“

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ ”اگر نہ ڈانٹوں تو تم میری چھوٹی سی پیاری سی فرینڈ بن سکتی ہو۔“

”جی سرا!“ اس کی بھوری آنکھوں میں دیے سے جل

اٹھے تھے۔ اس روز سے وہ بہت حساس سمجھ دار ذہین اور عام بچوں کی طرح ضد نہ کرنے والی مومو میری بہت اچھی دوست بن گئی۔ وہ مجھ سے بہت سی باتیں کرتی تھی، یہاں تک کہ جب وہ ڈائریکٹ دن میں داخل ہونے کے بعد اسکول جانے لگی تو شام کو اپنے پورے دن کی روئید اور مجھے سناتی تھی۔

جہاں اس کی پڑھائی کی ذمہ داری مجھ پر تھی، وہاں اس کے اسکول فنکشنز اور پیرنٹ ٹیچر میٹنگز آئینڈ کرنا بھی میرا فرض بن کر رہ گیا تھا۔

اس طرح وہ میرا خیال رکھتی تھی۔ جس لمحے میں گھر میں داخل ہوتا، وہ بھاگ کر مجھے پانی پلاتی اگر آنٹی کے بعد

اصرار میں شام کو کھانا ان کی طرف کھالیتا تو مومو ہمیشہ میرے قریب بہت الٹ سی بیٹھی ہوتی تھی۔ جو نمی میں

آخری نوالہ لیتا، وہ فوراً ”اٹھ کر ٹشو کاؤبہ میرے سامنے کر دیتی“ مجھے کبھی بھی مومو کو کسی بھی چیز کے لیے پکارنے کی

عادت ہی نہ پڑی تھی، اسی لیے میں ساری عمر سیکھ ہی نہیں سکا کہ اس مڑی ہوئی پلکوں والی لڑکی کو پکارنا ہے۔

”حسان صاحب! بہتر تھا کہ مہر کے نادر آتے۔“ مومو کی کلاس تھری کی انچارج (نام مجھے یاد نہیں) نے مجھے

پیرنٹ ٹیچر میٹنگ میں دیکھ کر بے اختیار کہا تھا۔

”وہ لانا کیا گئے ہوئے ہیں۔“

”کیا وہ ہمیشہ کہیں نہ کہیں گئے ہوئے نہیں ہوتے؟ خیر“

یہ دیکھیں مہر انشاء نے کلاس روم کا گل دان توڑ ڈالا ہے۔“

”اس سے غلطی سے ٹوٹا ہو گا، ورنہ وہ خاصی سمجھ دار ہے۔“ پھر بھی آپ ناخن بتائیں۔“ میں نے جیب میں

بنوے کے لیے ہاتھ ڈالا۔

”میں نے آپ کو جرمانہ بھرنے کے لیے نہیں بلایا۔“

ہاگ بر رکھی عینک کے پیچھے سے مجھے دیکھتے ہوئے ان کا

انداز قطعی اور دیوک تھا۔ ”مومو نے گل دان توڑ دیا، یہ

قابل معافی بات تھی، مگر اس نے بجائے مجھے بتانے کے،

ٹوٹے گل دان کی کرجیاں کپ بورڈ میں چھپا دیں۔ وہ تو بعد

میں میں نے سختی سے پوچھا تو اس نے بتایا۔“

میں لب بھینے انہیں دیکھتا رہا۔

”مجھے غصہ گل دان توڑنے پر نہیں بلکہ اس کا اپنی

غلطی پر پردہ ڈالنے پر چڑھا ہے۔ وہ ہمیشہ یہی کرتی ہے۔“

”میں اسے سمجھاؤں گا میڈم!“

اسی شام مومو کو اپنے سامنے اسٹڈی روم میں بٹھا کر

میں کافی دیر اب بیٹھنے، سنجیدہ نگاہوں سے اس کا چہرہ کھتا رہا۔

”کیا ہوا سرا؟“ میری نگاہوں کی سنجیدگی سے قدرے

خائف سی ہو کر اس نے مڑی ہوئی پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

”مومو تم نے واز توڑا ہے؟“

بھوری آنکھوں میں یکبارگی خوف سٹ آیا۔ ”آپ کو

کس نے بتایا، سرا؟“

”مجھے میری بات کا جواب دو۔“ میں نے تیز لمبے میں

کہا۔ س نے سر جھٹک لیا۔

”مومو۔“ میں نے لہجہ قدرے دھیمہ کر دیا۔

”غلطی سے ٹوٹا تھا۔“ اس کی باریک اور معصوم آواز

ابھری۔

”پھر تم نے اسے چھپا کیوں دیا؟“ اس نے ہاتھ پر آئے

ہاں بناتے ہوئے سراٹھا کر مجھے دیکھا۔ ”میڈم ڈانٹیں اس

لے!“

”اگر تم میڈم کو سچ بتا دیتیں تو وہ نہ ڈانٹیں۔“

”سچ بولنے پر ڈانٹ نہیں پڑتی؟“

”بالکل بھی نہیں!“ میں زور دے کر بولا۔

اس کے لبوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ در آئی۔

مٹ بالکل غلط اس روز حلیمہ کی بی بی سے کھلا ٹوٹ گیا تھا دادہ

نے پوچھا تو اس نے بتا دیا دادہ نے اسے بہت ڈانٹا۔ اس نے

مجھ کو بھی بولا تھا؟“ وہ میری ناگنگ جتنی لڑکی مجھ سے بحث

کر رہی تھی۔

اس کے انداز سے ناراضی جھٹک رہی تھی۔ ”اور میں

نے جھوٹ بھی نہیں بولا۔ میڈم نے مجھ سے پوچھا تھا تو

میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ میں نے نہیں توڑا۔“

”تم نے کچھ بھی نہیں کہا تھا“ اور یہ بھی جھوٹ ہوتا ہے۔“

”اور آپ بھی تو ہر پیرنٹ ٹیچر میٹنگ میں میڈم کو یہ

کہتے ہیں کہ پایا لایٹیا گئے ہوئے ہیں، پایا سنگاپور گئے

ہوئے ہیں، یہ بھی تو جھوٹ ہوتا ہے نا؟“

اس کا جملہ بہت غیر متوقع تھا۔ ”مومو! پایا بڑی ہوتے

ہیں۔“ میں نے بات کا رخ بدل کر اس بچی کو مزید صاف

گولی سے روکنا چاہا۔

”پتہ ہے۔“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

مجھے لگا وہ چھوٹی سی لڑکی مجھ سے ناراض ہو گئی ہے۔ اب

میں کیا کروں؟ اسے کیسے مناؤں؟ مجھے تو مومو کو منانا ہی

نہیں آتا تھا۔

میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ جانے سے پہلے حلیمہ

ایسے روز چائے کا ایک کپ پکڑاتی تھی جو وہ مجھے لا کر دیتی

تھی، مگر میں جانتا تھا۔ اس روز مومو نہیں آئے گی، اسی

لئے جانے لگا۔

”سرا! چائے!“ جانے کس کونے سے نمودار ہو کر اس

نے اپنے گھٹے نئے ہاتھوں سے چائے کا کپ میرے سامنے

رکھا، مجھے بے حد حیرت ہوئی تھی۔

شاید مومو ناراض نہیں تھی۔

یا پھر شاید اسے مجھ سے توقع نہیں تھی کہ میں اسے

مناؤں گا۔



مومو آٹھ برس کی ہوئی تو میں نے اسے رنگین صفحوں

والی غالب ”سنڈر بلا“ اسٹوری بک لا دی۔ اگلی شام جب

میں حسب معمول اسے پڑھانے آیا تو اس نے مجھے

مینٹس کے نیپلز سنانے کی بجائے سنڈر بلا کے متعلق

سوالات کرنے شروع کر دیے۔

”سرا! سنڈر بلا کے باپ نے دوسری شادی کیوں کر لی

تھی؟“ اس کا معصوم ذہن جو سوالات جتا تھا، وہ ان کے

جوابات مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

اس روز اس نے ہاتھوں کی فریج بریڈ بنا رکھی تھی جبکہ

اسکرت اور بلاؤز میں ملبوس تھی۔ رنگ تو مجھے یاد نہیں،

اب اس پڑھانے میں، میں ستر کی دہائی میں ہونے والی باتیں

باریکوب کے ساتھ تو یاد نہیں رکھ سکتا، بہر حال وہ بچپن

میں عموماً اسکرٹس پہنا کرتی تھی جو اس پر بے حد اچھی لگتی تھی۔

”سر! مجھے اور بھی بکس لادیں۔“ اس نے فرمائش کی

میں نے دیکھی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا دیا۔

پھر آہستہ آہستہ میں مومو کے لیے چھوٹے چھوٹے تحائف لانے لگا۔ میرے گفٹس ہمیشہ کوئی اسٹوری بک یا کٹرنگ بک ہوتے تھے۔

پھر ایک دن آنٹی نے مجھے ٹوک دیا۔ ”حسان! وہ اتنی سی ہے اس کو اتنی کتابیں مت پڑھاؤ۔“

مگر میں نے ہنس کر بڑی دیا کہ ”رہنے دیں! میں تو دیکھ بھال کرا چکی کتابیں ہی لاتا ہوں، جو اسے شعور دیں۔“ تو آنٹی خاموش ہو گئیں۔

اس روز بھی اس کے لیے بک خریدنے اسٹور پر گیا تو مجھے اشفاق احمد کی ”ایک محبت سوانح“ وہاں نظر آئی

میں نے وہ خرید لی اور اس میں سے دو ایسے افسانے جو ہر لحاظ سے مومو کی عمر کے لحاظ سے محبوب اور غیر موزوں نہ تھے مارک کر لیے۔

”یہ دو پڑھ لیتا۔“ شام کو اسے کتاب دیتے ہوئے میں نے تاکید کی۔

اس نے عدم دلچسپی سے کتاب اٹھائی، الٹ پلٹ کر دیکھا اور قدرے اداسی سے واپس رکھ دیا۔

”آپ کوئی اور بک لے آتے سر۔“ اسے شاید اتنی عجیبی اور دوامی کتاب میں دلچسپی نہ تھی۔

”شاید پسند نہیں آئی تمہیں۔ مگر پڑھ کر دیکھ لو۔“

”یہ بات نہیں ہے، سر!“ اس نے سر جھٹکا، پھر عادتاً

میز پر کہنی رکھتے ہوئے بولی ”دراصل میں یہ پڑھ چکی ہوں۔“

مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ”تم، تم یہ پڑھ چکی ہو؟ کہاں سے لی؟“

”بیانی لا بیری سے۔“ وہ بڑے فخر سے مسکرائی۔

”مومو! تم مجھ سے پوچھ کر بکس پڑھا کر۔“

اس کے لبوں سے مسکراہٹ یکدم معدوم ہو گئی، وہ کہنی میز سے ہٹا کر قدرے موڈب سی ہو کر بیٹھ گئی۔ ”جی سر!“

وہ ڈر گئی تھی اسی لیے نرم لہجے میں اس سے کہا۔

”وہ اس لیے کہ میں تمہیں ان کا بیک گراؤنڈ وغیرہ سمجھا سکوں۔“

اس کے چہرے پر مجھے قدرے اطمینان دکھائی دیا۔ میرا خیال تھا۔ اب وہ مجھ پر اعتبار کرنا سیکھ لے گی، مگر یہ میری بھول تھی۔ ہاں، یہی تو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، یہی کہ ہم

میں سے کسی کو دوسرے پر اعتبار نہ تھا، مگر ایسے آپ کو میری بات سمجھ نہیں آئے گی۔ آپ کو مومو کی پوری داستان سننا پڑے گی۔

☆ ☆ ☆

مومو میرے سامنے بیٹھی سائنس کا ہوم ورک کر رہی تھی، میں اخبار پڑھتے ہوئے گا پے بگا پے اس پر نظر ڈال ہی لیا کرتا تھا۔ یکدم مجھے کچھ یاد آیا۔

”مومو!“ میں نے اخبار تہہ کر کے میز پر رکھتے ہوئے اسے پکارا۔ وہ جو کاپی پر جھکی ہوئی تھی، ہاتھ روک کر مجھے دیکھنے لگی ”جی سر؟“

”تمہارا ٹیسٹ ہو گیا سائنس کا؟“

”جی سر!“

”کتنے مارکس آئے؟“

وہ ہل بھر کو خاموش رہنے کے بعد بولی ”وہ تو پچھرنے واپس ہی نہیں کیا۔“

میں انہیں خال کا مزدور وہ نوسال کی بچی، مجھے صاف پتہ چل گیا وہ جھوٹ بول رہی تھی۔

”کھڑی ہو جاؤ!“ ایک دم میں دوست سے نیچر بننے ہوئے درشتی سے بولا ”وہ کالنگا کھڑی ہو گئی۔“

”اپنا بیک کھول کر مجھے دکھاؤ۔“ میں نے حکم دیا۔ وہ

مرے مرے ہاتھوں سے بیک کھولنے لگی۔ وہ جان بوجھ کر آہستہ آہستہ کھول رہی تھی، میں نے بیک اس سے لے کر

کھول دیا۔ سامنے سائنس کا ٹیسٹ پڑا تھا۔ میں نے ایک کالٹ دار نگاہ اس پر ڈال کر ٹیسٹ اٹھایا، پھر نمبر پڑھ کر

ٹیسٹ اس کے سامنے پھینکا۔

”یہ اس پر سے 10 میں سے 4 نمبر پڑا کر مجھے بتاؤ کہ تم نے nutrition والا سوال کیوں نہیں یاد کیا تھا اور مجھے یہ

بھی بتاؤ کہ تم نے ٹیسٹ چھپایا کیوں؟“ اس کی یہ غلطی کر کے چھپا دینے کی عادت مجھے خوب تاؤ دلا رہی تھی۔

اس نے سر جھٹکا دیا۔ ”میں ڈرامہ دیکھنے لگی۔ تھی اور چھپایا اس لیے کہ آپ ڈانٹتے۔“

”میں نے تمہیں ہزار دفعہ سمجھایا ہے کہ غلطی کر کے اس پر پردے مت ڈالو مگر تم ہو کہ۔“ غصے سے میں

اٹھا، میز سے چابی اٹھائی اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

مجھے مومو پر شدید غصہ تھا۔

اگلے دو دن میں اسے پڑھانے نہیں گیا، تیسرے روز مجھے ایک عجیب سی فکر مندی ہوئی۔ مجھے اس کو ڈانٹنا نہیں

بلکہ آرام سے سمجھانا چاہیے تھا۔ وہ اتنی اکیلی ہے اور میں۔۔۔ اسی شام میں حیدر کی طرف چلا گیا۔

مومو حسب معمول اسٹڈی میں نہیں تھی، مجھے وہ سر گھٹنوں میں لیے بیڑھیوں پر بیٹھی نظر آئی۔ میں چند

بیڑھیاں چڑھ کر اس کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔

”سبیلو چھوٹی لڑکی!“

اس نے چونک کر سر اٹھایا، اس کی بھوری آنکھوں میں سرخی تھی، اور گالوں پر آنسوؤں کے نشانات مجھے یکدم بے چینی سی ہوئی۔

”کیا ہوا ہے مومو؟ تم رو رہی ہو؟“ اس نے نفی میں سر ہلا کر آنکھیں ہتھیلیوں سے رگڑیں۔

”بتاؤ مجھے کیا ہوا ہے؟“ میں پریشان سا ہو گیا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے سر ایک دفعہ پھر گھٹنوں پر رکھ دیا۔

”مومو مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟ کیا میری کسی بات پر ناراض ہو؟“ میں نے اس کو شانوں سے پکڑ کر اس کا سراونچا کیا۔

”نہیں سر!“ اس کے انکار پر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ میرا خیال تھا وہ میرے ڈانٹنے پر رو رہی تھی۔

”پھر؟“ میں نے جاچتی نگاہ سے اسے دیکھا۔

”نچلا لب کاٹتے ہوئے وہ اپنے پاؤں کو دیکھنے لگی۔

”مومو!“ میں نے پھر اسے پکارا۔

”سر۔۔۔“ ضیائے۔۔۔ ضیائے بہت برا کیا ہے۔“ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”ضیا کون؟ کیا کر دیا اس نے؟“ میں پوچھتا ہوا گیا تھا۔

”جنرل ضیا اور کون، سر؟“ اس نے شام کی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”ضیائے کل بھٹو کو پھانسی دے دی ہے۔“

”لا حول ولا قوۃ! مومو تم۔۔۔!“ مجھے اس وقت اس پر شدید غصہ آیا تھا ”یہ بات تھی جس پر تم نے مجھے اتنا پریشان کیا ہے؟“

”آپ کو افسوس نہیں ہوا سر؟“ اس کے انداز میں حیرت تھی۔

”مومو! یہ پالیسی کس ہے، تم اتنی سی عمر میں ان سیاست دانوں کو نہیں سمجھ سکتیں اور مجھے نہیں پتہ تھا کہ

تمہیں بھٹو اتنا پسند تھا“ میرا عملی طور پر سیاست سے کوئی واسطہ نہ تھا، مگر چونکہ ابو کرم مسلم لیگ تھے تو ظاہر ہے میری

بہم رویاں ضیاء کے ساتھ تھیں۔ ایسے میں مومو کا رویہ میرے لیے حیران کن تھا۔

”سر! مجھے پالیٹکس کا پتہ نہیں، مگر بھٹو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔“ وہ افسوس سے کہہ رہی تھی۔

”دامغ خراب ہے تمہارا۔۔۔ یہ تمہاری عمر ہے سیاست میں دلچسپی لینے کی؟ خبردار جو میں نے تمہیں آئندہ اخبار پڑھنے دیکھا۔ اتنا پریشان کیا تھا مجھے اب انھو ذرا“

”مگر سر۔۔۔“ میں اس کی ایک سنے بغیر اسے باہر لے آیا۔

”ارے حسان! دیکھو ذرا اس لڑکی کو کیا ہوا ہے؟ صبح سے کمرے میں بند ہے۔“ مجھے دیکھ کر آنٹی کو مومو کی اداسی کا خیال آیا۔

”یہ میرے ساتھ کھڑی ہیں محترمہ! کچھ نہیں ہوا، بس ذرا اس دامغ خراب ہو گیا ہے۔ ابھی ٹھیک کر کے لاتا ہوں۔“

”میں مومو کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے آیا۔

”کدھر سر؟“

”کیس جا کر تمہیں آنسکریم کھلاتے ہیں، تاکہ تم پر سے یہ سوگ اترے۔“ مجھے ابھی تک غصہ پڑھا ہوا تھا۔

”سر!“ اس نے تاسف سے مجھے دیکھا۔ ”آپ کو پتا ہے میں آنسکریم نہیں کھاتی“

”افوہ؟“ وہ جتنا میری باتیں یاد رکھتی تھی، میں اتنا ہی بھول جاتا تھا۔ مومو کو میٹھے کے نام پر ہر شے سے الرجی تھی۔

”میری زندگی میں آنے والی واحد لڑکی تھی جو چاکلیٹ کو too sweet اور آنسکریم کو too cold کہہ کر رد کرتی تھی۔“

”چلو چل کر کڑوی سی کافی پیئے ہیں، وہ تو تم شوق سے پیو گی نا؟“ میرے جلتے بھنے انداز پر وہ ہنستے ہوئے گاڑی کی جانب بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

میں نے جوں ہی چائے کی پیالی سے آخری گھونٹ بھرا، میرے سامنے والے صوفے سے مومو اٹھی اور اندر چلی

”حسن شادی کرلو۔“ آنٹی نے اپنا مک ختم کر کے میز پر رکھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔
”اچھا!“ قدرے ہنس کر میں نے چائے کا کپ سائیڈ پر رکھا۔

چند ٹانسی بعد وہ خود ہی واپس آگئی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں پچھلی اداسی کو میں ماں کی موت کا ہر ہوتا زخم بیان کر خاموش رہا۔

وہ ہوں ہاں میں جواب دیتی یا خاموش رہتی۔
میں اس کے روکھے روپے کی وجہ نہیں جان پایا تھا۔
"سر! میرا ٹیسٹ!" ہم واپس جانے لگے تو اس نے مجھے
یہ دہرایا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ میں رک جاؤں اور نامہ چلی
جائے۔

وہ چھوٹی بچی جسے کسی وجہ سے نام نہ بری لگتی تھی اس کی ذات سے بھی جھوٹی باتیں منسلک کر کے مجھے بتا رہی تھیں۔ بچے عموماً ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور میرے نزدیک یہ ایسی بڑی بات نہ تھی۔

”جی کئی دفعہ۔“ اس کے انداز میں سنجیدگی تھی۔ میں نے گردن پھیر کر اسے دیکھا۔ وہ میرے بائیں طرف روش بر میرے ہمراہ چل رہی تھی۔ اس کا سر میرے بائیں بازو کی گھنٹی تک پہنچ رہا تھا۔

مرکزی دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ گولڈن کلر کے خوب صورت ہینڈل پر رکھ کر اسے گھمایا ہی تھا کہ دروازے کی درز سے اندر سے آنے والی بلند آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”بشیرا! بشیرا!“ وہ نامہ تھی اور وہ چارہ ہی تھی۔ ”کدھر مر جاتی ہو؟ نشہ کر کے سوئی ہو؟ ادھر آؤ یہ برتن تمہارا باپ اٹھائے گا؟“

میرے قدم جہاں تھے وہیں تھم گئے۔ میں سُن سا ہوں کہ وہ گیا۔ مومو کا ہاتھ ابھی تک ہینڈل پر تھا۔ اس نے سر گھما کر میری طرف دیکھا اور بے نیازی سے بولی۔

”See I told you!“ اس نے بے نیازی سے شانے جھٹکے ”مگر آپ کو مومو ہمیشہ جھوٹی ہی لگتی ہے۔“ اس نے ہینڈل گھما کر دروازہ پورا کھولتے ہوئے زور سے ناک کہا ”نامہ آنٹی سے وی کم ان؟“ آج اس کا لہجہ کھردرا یا روگھا نہیں بلکہ فاتحانہ اور سرخ روئی کا تاثر لے ہوئے تھا۔ میں خود کو کمپوز کر کے زبردستی چہرے پر مسکراہٹ سجائے اس کے پیچھے اندر داخل ہوا۔

نامہ جولاؤج میں صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر کئی دی دیکھ رہی تھی، ہمیں دیکھ کر بری طرح چونکتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے آپ لوگ آئیے نا۔۔۔ لباس کی ٹکلیں درست کر کے اس نے دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا۔

”دراصل بیل خراب تھی اس لیے ہم بلا جھجک اندر آ گئے۔ آنٹی کہاں ہیں ان کی چیزیں دینا تھیں۔“ میں نے کھڑے کھڑے وضاحت کی جبکہ مومو بڑے آرام سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”مُمی تو سو رہی ہیں، ٹھہرس میں اٹھاتی ہوں۔“ وہ اپنی مصنوعی شائستگی سے کہتے ہوئے اندر جانے لگی مگر میں نے فوراً ”روک دیا۔

”نہیں انہیں مت اٹھائیں۔ بس بتا دیجیے گا کہ میں آیا تھا۔ چلو مومو۔“ میں نے مومو کو پکارا جو بڑی خوشی خوشی نامہ کے لاؤنج کا جائزہ لے رہی تھی۔

”آپ لوگ بیٹھیں تو سہی۔“ اس نے صوفے پر رکھے

کشن درست کیے۔

”نہیں نہینکس نامہ! ہم چلتے ہیں۔ مومو کی ٹیوشن وقت ہونے والا ہے۔ چلو مومو!“

میں نے صوفے پر استحقاق سے بیٹھی مومو کو گھورا۔

”کوئی بات نہیں سب اکل کوئی ٹیسٹ نہیں ہے۔ آنٹی چھٹی ہو جائے گی تو کچھ نہیں ہوگا۔“ اس نے اطمینان سے مدبرانہ انداز میں کہا۔

”بہت شوق ہے تمہیں چھٹی کا، چلو اٹھو۔“ بوکھلائی گھبرائی نامہ کو خدا حافظ کہہ کر میں مومو کو ہاتھ سے پکڑ کر کچھنچتا ہوا باہر لے آیا۔ واپسی پر تمام راستہ ہم دونوں میری کوئی بات نہ ہوئی۔ جب میں نے گاڑی اس کے گیٹ کے سامنے روکی تو اس نے اترنے کے لیے لاگ کھولا۔

”مومو!“ میری آواز پر وہ دروازہ کھولتے کھولتے رک گئی ”جی سر؟“

”جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے تب تم نے کیوں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہا؟“ میں بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

اس نے اپنی مڑی ہوئی پٹلیں اٹھائیں۔ ”سر! داد دہتی ہیں جو لوگ سچے ہوتے ہیں انہیں صفائی دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سرائی جبران کتا تھا“

”نہ کہا میں نے مان لیا، اس نے زور دیا، مجھے شک گرا“ اس نے قسم کھائی، میں نے کہا یہ تو جھوٹ بولتا ہے۔

”نہیں سے مسکرائی۔ ”پھر بھی سرائی آپ کو میں ہمیشہ جھوٹی ہی لگتی ہوں۔“ ”مگر مومو۔۔۔“

”میں جاؤں سر؟“

میں نے ایک گہری سانس اندر کو کھینچی اور اثبات سے سر ہلا دیا۔

”ہاں جاؤ۔“

”خدا حافظ سرائی! وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب عفت آنٹی سرسری طور پر مجھ سے حسن کی آمد کا تذکرہ کیا۔ حسن نامہ کا ماموں زاد تھا، وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسے اسٹیشن کا کوئی ہیرو ہوتا ہے۔ بے تحاشا دولت مند، خوب صورت اور شاندار پر سنائی رکھنے والا۔ حسن امرا

سینلڈ تھا۔ اس کا اور اس کے والد کا وہاں کین فوڈ کا وسیع بزنس بزنس تھا۔ وہ دونوں سال دو سال بعد پاکستان کا چکر بڑی لیتے تھے مگر اس دفعہ وجہ کچھ خاص تھی۔

آنٹی نے مجھ سے ذکر نہیں کیا مگر ہر حال میں کوئی بچہ تو نہ نہیں۔ تینتیس سالہ میچور مرد تھا۔ اتنا تو ہر حال جان گیا تھا کہ حسن کے والد احمد مراد نے نامہ کا رشتہ میرے اور نامہ کا رشتہ طے ہو جانے کے چند روز بعد مانگا تھا۔ وہ یقیناً اس بات سے لاعلم تھے کہ میرا رشتہ نامہ کے

دین قبول کر چکے ہیں۔ چونکہ ابھی صرف زبانی کلامی بات ہوئی تھی اس لیے نامہ کے گھر والوں نے ہمارا رشتہ اپن نہیں کیا تھا۔ اس کے ماموں کو ان کے اصرار پر اس بات کا علم ہوا تو وہ اپنے بیٹے سمیت پاکستان پہنچ گئے۔ میں نے ان دنوں نامہ کے گھر جانا قطعاً ترک کر دیا تھا۔

اور پھر جب میں اس روز مومو کو پڑھانے گیا تو آنٹی مجھے اندرے بجھی بجھی لگیں۔ میں پوچھتے بغیر نہ رہ سکا۔

”کیا بتاؤں حسان! اتنے چاؤ سے تمہارا رشتہ کرایا تھا۔ پہلے تو وہ لوگ راضی تھے مگر اب کھنچے کھنچے لگ رہے ہیں۔ نفٹ آیا کو کل فون کیا تو منگنی کی بات پر وہ کہنے لگیں پھر

دیکھا جائے گا، ابھی تو رشتہ بھی پینڈنگ میں ہے۔ تو بھلا دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سرائی جبران کتا تھا“

”جائے دیں آنٹی! آپ ایسے ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔“ میں نے فس کر ٹال دیا۔ اسی اثناء میں حیدر داخل دروازہ

خول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں کوٹ تھا۔

”کیسے ہو حسان؟“ وہ جھکی جھکی آواز میں پوچھتا میرے ذہنل بیٹھ گیا۔

”میں تو ٹھیک ہوں، آنٹی البتہ پریشان ہیں۔“ اس نے انا کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ جواباً ”آنٹی نے الف سے بے تک تمام قصہ کہہ سنایا۔

”مُمی ٹھیک کہہ رہی ہیں، وہ نامہ کا کزن نہیں ہے، یہاں سے اس کا؟“ حیدر نے آنکھیں میچ کر یاد کرنے کی کوشش کی۔

”حسن“ میرے لبوں سے پھسلا۔ ”حسن! میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے بھی ڈیزائن وائر اور قیمتی جیو لری صرف شاپس میں بچی دیکھ سکیں اور پھر ان سے فقط اپنے خواب سجا پائیں۔ میں نے خواب سجائے تھے۔ میں ساری زندگی صرف خوابوں پر گزارا نہیں کرنا

تھی۔ کوئی کاروبار ہے حیدر میاں جہاں وعدے کر کے

توڑ دیے جائیں! آپا نے ہمیں زبان دی تھی۔ اگر بھانجاء ہی پیارا تھا تو پہلے اس کا خیال کیوں نہ آیا۔ اس وقت تو بہت خوشی خوشی میرے حسان کا رشتہ قبول کیا تھا۔“ وہ بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

حیدر نے مسکرا کر سر جھکا ”مُمی بہت بھولی ہیں۔“ ”پاپا جوس۔“ مومو کی بول کے جن کی طرح آواز اور بچ جوس کا گلاس تھا میرے حیدر کے قریب نمودار ہوئی۔

”تھینک یو مینا!“ حیدر نے گلاس لے لیا۔ میں نے اس کے لہجے پر غور کیا۔ خوش دلی، شفقت، اپنائیت سب تھا اس میں، بس محبت نہیں تھی یا پھر وہ اتنی میکا کی زندگی گزارنے لگا تھا کہ محبت ہوئی بھی تو محسوس نہ ہوتی تھی۔

میں نے مومو کا چہرہ دیکھا، وہاں کوئی رنج، افسوس نہیں تھا۔ میں گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

حیدر اور آنٹی کی باتوں کے باوجود میں نے حسن مراد کی آمد کو نظر انداز کیا تھا مگر پھر نامہ کا میرے آفس فون آیا۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ 20 جولائی 1981ء دن

گیارہ بج کر پچیس منٹ وہ وقت میرے دماغ پر ثبت ہو کر رہ گیا ہے۔ میں جاہوں بھی تو نامہ کی وہ کال نہیں بھلا سکتا۔ میں نے آپ کو کہا تھا کہ مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔

میں آپ کو یہ بتانا چاہتا تھا لیکن ابھی آپ کو سمجھ میں نہیں آئے گا۔ آپ کو میری بات سمجھنے کے لیے میری پوری کہانی سننی پڑے گی۔

”حسان!“ اس نے بہت شرمندہ شرمندہ لہجے میں کہا تھا۔ ”آپ بہت اچھے ہیں اور کوئی بھی لڑکی آپ کے ساتھ

پر فخر کر سکتی ہے لیکن میں وہ لڑکی نہیں ہوں۔ میں بچپن میں بہت سی چیزوں کے لیے ترستی تھی جن میں ایک آسائشات کی فراوانی بھی تھی۔ گو اب ہمارے حالات

بہت اچھے ہیں مگر میں بچپن کے وہ چند سال کبھی نہیں بھول سکتی، جب ابو کی نوکری چھٹی تھی اور ہم نے اپنا گھر بیچ ڈالا تھا۔“ اس نے گہری سانس خارج کی۔ اس کی سانس کے اخراج کی آواز مجھے آج بھی یاد ہے۔

”حسان! میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے بھی ڈیزائن وائر اور قیمتی جیو لری صرف شاپس میں بچی دیکھ سکیں اور پھر ان سے فقط اپنے خواب سجا پائیں۔ میں نے خواب سجائے تھے۔ میں ساری زندگی صرف خوابوں پر گزارا نہیں کرنا

تھی۔ کوئی کاروبار ہے حیدر میاں جہاں وعدے کر کے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیش کش

(WWW.PAKSOCIETY.COM)

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے آپ کیلئے پیش کیا۔

ہم خاص کیوں ہیں؟؟؟؟

یہ واحد ویب سائٹ ہے جہاں سے تمام ماہنامہ ڈائجسٹ، ناول، عمران سیریز، شاعری کی کتابیں، بچوں کی کہانیاں، اور اسلامی کتابیں

ڈائریکٹ ڈاؤن لوڈ کرنے کے ساتھ ساتھ آن لائن پڑھ بھی سکتے ہیں۔

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

اگر آپ کو ویب سائٹ پسند آئی ہے تو پوسٹ کے آخر میں اپنا تبصرہ ضرور دیں۔

اپنا تبصرہ صرف پوسٹ تک محدود رکھیں۔ درخواست کے لئے رابطہ کا صفحہ استعمال کریں۔

اپنے دوست احباب کو بھی پاک سوسائٹی کے بارے میں بتائیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی انتظامیہ سے مالی تعاون کیجئے۔ تاکہ یہ منفرد ویب

سائٹ آپ کیلئے جاری رکھی جاسکے۔

پاکستانیوں کے ویب سائٹ

WWW.Paksociety.Com



Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

(خونین ڈائجسٹ 138 اگست 2008)

امریکی کی طرح ساری زندگی میرے ساتھ رہی۔
جس روز مومو کا 8th کلاس کا رزلٹ آنے والا تھا،
اس نے مجھے آفس فون کیا۔
”سر! آپ نے اخبار دیکھا؟“ اس کی آواز میں اتنی
خوشی اور جوش تھا کہ میں چوکے بغیر نہ رہ سکا۔
”کیوں کیا ہوا؟“

”سر میں نے فڈل بورڈ میں ٹاپ کیا ہے۔ اخبار
دیکھیں نا!“ اس کی تھکتی آواز سن کر میں رو نہ سکا، میں
سارے کام چھوڑ کر اپنے تک چڑھے پاس کی پروا کیے بغیر
حیدر کے گھر چلا آیا۔
وہ جولان میں اخبار گود میں رکھے بیٹھی تھی، میری گاڑی
گھر کی حدود میں داخل ہوتے دیکھ کر بھاگتی ہوئی میرے
پاس آئی۔ ”سر! آپ آگئے؟“

اس کی سنہری رنگت شدت جذبات سے گلزار ہو رہی
تھی۔ مسکراہٹ اس کے لبوں سے جدا نہیں ہو رہی تھی
بلکہ وہ ہنس رہی تھی۔

اس نے اپنی گاڑی سے لان تک چلتے ہوئے بارہ بار
مومو کو دیکھ کر مجھے یوں لگا تھا کہ ”خوشی“ ایک مجسمہ
صورت میں میرے سامنے کھڑی ہے۔

”سر۔۔۔ یہ اخبار دیکھیں نا“ میں نے ٹاپ کیا ہے۔
اس نے اخبار آگے کرتے ہوئے وہ سطر مجھے دکھائی جہاں
”رائساء حیدر“ جگہ گرا ہوا تھا۔

اس کی پر جوش کیفیت پر مجھے ہنسی آگئی۔ اس کا رزلٹ
دیکھنے کے لیے اخبار نہیں، اس کا تعلق رنگ چہرہ ہی کا
تھا۔

”مجھے تم پر فخر ہے مومو!“ اخبار اس کے ہاتھ سے لے
کر اس کا نام پڑھتے ہوئے میں نے خوشی سے فخور لہجے پر
کہا۔ اس نے مجھے مومو کے سچے ہونے کی حیثیت سے اتنی
خوشی ہوئی تھی کہ بیان نہیں کر سکتا۔

”مہرائساء“ آئی ایم سوپراؤڈ آف یو!“ میں نے اس کی
ری کاٹ کر تھپتھپایا۔ ”اینڈ آئی لو یو سوچ!“ اس کی
مسکراہٹ ایک لمحے کو وہیں ٹھہر گئی، وہ ایک دم توجہ
سانس لینا ہی بھول گئی تھی۔

”You do sir“۔ ”اس کے لہجے میں بے
خوشگوار حیرت تھی۔
”آف کورس!“ میں مسکرایا۔ ”ہماری مومو بے
اتنی اچھی اس سے سب سے پیار کرتے ہیں۔“

چاہتی۔ یونانی کماوت ہے خوش قسمتی کی دیوی آپ کے
دروازے پر صرف ایک دفعہ دستک دیتی ہے۔ میرے
دروازے پر وہ دیوی دستک دے رہی ہے۔ پلیز مجھے زندگی
سے اپنے لیے کچھ حاصل کر لینے دیں۔“
وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر میں نے فون رکھ دیا۔
میرے اندر بہت کچھ نوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔

نامہ سے مجھے کوئی افسانوی قسم کا دعواں دعار سا عشق
نہیں ہوا تھا۔ وہ تو ایسی تھی جیسے راہ چلتے بہت سے لوگ
مل کر پکڑ جاتے ہیں۔ وہ تو اسی دن میرے لیے بہت عام ہو
گئی تھی جب میں نے اس کی ”شائستگی“ سنی تھی۔ وہ تو
کبھی بھی خاص نہیں تھی۔

میرے لیے صرف ایک شے خاص تھی۔ وفا اور صرف
وفا۔ میری ماں مجھے بچپن میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ایک
عورت کی اس بے وفائی نے میرے اندر جو خلش رکھ
چھوڑی تھی وہ میں کسی دوسری عورت کی وفا سے پر کرنا
چاہتا تھا مگر۔

20 جولائی کی اس گرم دھیر کو مجھے علم ہوا تھا کہ عورت
تو بے وفائی کا دوسرا نام ہے۔ کبھی میری ماں مریم ثار کی
دوبارہ گھر سامنے کی خواہش کی صورت میں اور کبھی نامہ
سعید کی زندگی سے چھ حاصل کرنے کی تمنا کی صورت میں
بے وفائی رنگ بدلتی ہے مگر میں اسے ہر روپ میں پہچانتا
تھا۔

جانتا ہوں آپ لوگوں میں سے بہت سوں کو میری بات
سخت ناگوار گزرے گی، مگر میں نے کہا نا آپ میری تیہوری
میری منطق، میری دلیل ابھی نہیں سمجھ سکتے۔
میں پھر کہوں گا کہ آپ کو میری پوری کہانی سننی پڑے گی۔

ناعمہ سے منگنی میں نے اسی شام توڑ دی، آنٹی نے
خاموشی سے میری بات سنی اور اسی وقت غصت آنٹی کو فون
کر کے سب کچھ توڑ ڈالا۔

نامہ کی شادی اسی سال سردیوں میں ہو گئی، وہ چند
ہفتوں بعد امریکہ شفٹ ہو گئی اور جن دنوں مومو 8
میں تھی، ناعمہ کے ہاں دو جڑواں بیٹوں کی پیدائش ہوئی،
ناعمہ خواب و خیال، حال یا مستقبل میں کہیں بھی نہیں
تھی مگر اس کی عطا کردہ خلش کسی درخت سے چٹنی

وہ ایک دم بہت کھل کر ہنسی جتنی خوشی اسے میرے لپٹنے پر ہوئی تھی، اتنی تو شاید اپنے رزلٹ پر بھی نہیں دیتی تھی۔

”نکھڑو میں تمہارے لیے کچھ لایا ہوں۔“ میں نے باڑی کا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر رکھا سرخ گلابوں کا کے اور ایک بند بیکٹ اٹھایا، جو میں نے راستے میں سے لیا تھا۔

”یہ تمہارا گفٹ میں جلدی میں ہی لاسکا ہوں۔“

”اوہ سرا“ فرط جذبات سے اس کی آواز رندہ گئی، اس نے دونوں چیزیں تمام لیں ”پھول بہت تھے سرا“ اس کے انداز میں تشکر تھا۔

”پھول بہت نہیں تھے، یہ تو مرچھا جائیں گے، مگر یہ گفٹ تو تمہارے پاس ہمیشہ رہے گا۔“ میری مادہ پرست سوچ کی پروازیں ٹھک گئی۔

”مرچھانے سے کیا ہوتا ہے سرا؟ ان کی خوشبو ان کا اثر اور سب سے بڑھ کر ان کا میسج نہیں ختم ہوتا۔“ سرخ گلابوں کے بکے کو چرے کے قریب لے جا کر اس نے آنکھیں موند کر اسے سونگھا۔

”اچھا کھو لو تو بتاؤ تو سہی تمہیں کیسے لگا ہے۔“ میں نے اس کی بات پر غور نہیں کیا، میں نے کبھی بھی مومو کی بات پر غور نہیں کیا تھا۔

وہ پھول گاڑی کی چھت پر رکھ کر وہیں پورچ میں کھڑے کھڑے احتیاط سے ریپر کھولنے لگی۔ میں اپنی گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا اس کی ایکساٹمنٹ سے محفوظ ہو رہا تھا۔

”واؤ!“ لائٹ پنک کھرکی ڈاکل والی خوب صورت گھڑی اس کو بہت پسند آئی تھی۔ اس نے جھٹ اس کو کلائی پر پہنا۔

”یہ اسٹریپ بند کر دیں سرا!“ اس نے معصومانہ انداز میں کلائی میری جانب بڑھائی، میں نے مسکراتے ہوئے پنک کھر کا اسٹریپ بند کر دیا۔

”کتنی اچھی ہے نا تمہیں پنک پور سرا!“ مختلف زاویوں سے گھڑی کو اپنی دودھیا کلائی پر سجا دیکھنے کے بعد اس نے بہت تشکر سے کہا تھا۔

”ارے یہ تو کچھ نہیں ہے کارنامہ تو تم نے انجام دیا ہے اچھا اب اندر آئے دو۔ کب سے ہم پورچ میں کھڑے ہیں اور حیدر کہاں ہے؟“ اندر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے میں نے پوچھ لیا۔

”ایسا ہے بند روم میں۔“

ایک لمحے کو میں نے سوچا کہ اس سے حیدر کی جانب سے ملنے والے تحفے کے متعلق پوچھوں مگر پھر مجھے خیال آیا کہ حیدر کے پاس اسے دینے کے لیے ایک نرم مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔

”آپ بیٹھیں، میں ذرا نوڈلز لے آؤں۔“ مجھے اسٹڈی روم میں بٹھا کر وہ جانے لگی تو میر نے اسے روکنا چاہا۔

”یہ کھانا پینا بعد میں ہو تارے گا“ ابھی تو بیٹھو۔“

”نہیں سرا پھر وہ ٹھنڈی ہو جائیں گی اور آپ دوبارہ گرم کی ہوئی چیزیں پسند نہیں کرتے۔“ وہ کہہ کر جلی گئی اور میں مسکرا کر رہ گیا۔

جب سے مومو نے چودھویں سن میں قدم رکھا تھا اس کو کھنگ کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ بقول آنی کے وہ حیدر یا ان کے لیے نہیں صرف میرے لیے کبھی چائیز تو کبھی کسی مرغن کھانے بناتی تھی۔ شاید اس کا یہ شوق اس دن کے بعد پیدا ہوا تھا، جب میں نے اسے باتوں باتوں میں کہا تھا ”مجھے اچھا کھانے کا شوق ہے۔“

وہ نوڈلز لینے گئی تو میں قدرے فراغت سے اسٹڈی روم کا جائزہ لینے لگا۔

میری اور مومو کی کرسی کے درمیان کبھی میز پر رکھے مومو کے اسکول بیگ کی زپ کھلی ہوئی تھی، جس میں سے ایک رنگ برنگی سی کتاب جھانک رہی تھی۔ میں نے قدرے متجسس سا ہو کر وہ کتاب جو دراصل ایک کلر فل سی ڈائری تھی نکالی۔ مومو ڈائری نہیں لکھتی تھی، میں نے پہلا صفحہ کھولا۔

وہاں Amna Ikram's scrap Book لکھا تھا۔

وہ اس کی دوست آمنہ اکرام کی اسکرپ بک تھی۔ جو اس نے یقیناً ”مومو کو فل کرنے کے لیے دی ہوئی۔“ چونکہ وہ ایک قطعاً ”غیر پرائیویٹ“ تھی، اس لیے میں اس کے صفحے الٹ پلٹ کر پڑھنے لگا۔

ایک صفحے پر آکر میں ہنہک کر رکنا صفحے کے اوپر نیلے مارکر سے Your First Crush لکھا تھا۔ نیچے آدھا صفحہ فل تھا جس میں ہر سطر میں لڑکیوں نے اپنے نام کے سامنے اپنے crushes لکھے رکھے تھے۔ میں نے صفحے

کے وسط میں آخری لکھی ہوئی سطر پڑھی۔

crush was zulfikar ali Bhutto”

”Mehrun Nisa my First

میں نے اسکرپ بک بند کر کے اسے میز پر واپس رکھ دیا۔ چند برس پہلے۔۔۔ اپنی گئی ایک خام خیالی آہستہ آہستہ میرے ٹھک میں مدلتی جا رہی تھی آہٹ پر میں سنبھل کر بیٹھ گیا، مومو ہاتھ میں بھاپ اڑاتے نوڈلز کے پیالوں سے جلی نرے لیے اندر داخل ہوئی۔

میں نے قدرے بے توجہی سے نوڈلز کھایا۔

”آپ کو اچھی نہیں لگی؟“ مومو اور دوسرے کی عدم دلچسپی محسوس نہ کرے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا چہرہ پل بھر میں اتر گیا۔

”نہیں، یہ بہت اچھے ہیں مگر مجھے تم سے بات کرنی تھی۔“ میں نے پیالہ میز پر رکھ دیا۔

”کیا بات سرا؟“ اس کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

”مومو، میں نے یہ اسکرپ بک پڑھی ہے، یو ڈونٹ مائنڈ اٹ، رائٹ؟“

”ناٹ ایٹ آں، سرا!“

”تم نے لکھا تمہارا فرسٹ کرش ذوالفقار علی بھٹو تھا، رائٹ؟“ میں سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”جی سرا!“ وہ اب کچھ الجھی تھی۔

”مومو تمہاری عمر کیا ہے؟“

”چودہ سال۔“

”اور تمہارا خیال ہے تمہیں ایسی باتیں کرنی چاہئیں؟“

”سرا، یہ صرف ایک مذاق تھا، فرینڈز کے درمیان ایک ہلکا پھلکا مذاق۔“

”یہ مومو کی کتابیں پڑھنے کے بجائے اپنی عمر کے مطابق فیشن، کپڑوں، جیولری اور مہندی کے ڈیزائنوں میں دلچسپی لیا کرو۔ اپنی عمر سے آگے بھاگو، پتہ چھٹک جاؤ گی، مومو!“

وہ سر جھٹک کر کتابیں کھولنے لگی۔ یہ اس کا خفگی کا اظہار تھا۔ میں نے گہری سانس بھر کر ٹھنڈے ہوئے نوڈلز کے پیالوں کو دیکھا جن کی تعریف میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے بھی نہیں کی تھی۔

”مومو جانتی ہو تمہارے ہاتھوں کا کیا مطلب ہوتا ہے؟“

اس روز اس کی لمبی پتلی، آرفسنک انگلیوں کو دیکھ کر میں نے بے ساختہ پوچھا تھا۔ وہ ہنس دی۔

”جی۔۔۔ یہی کہ میں پینٹریا سرجن بنوں گی۔“

”منڈیکل میں تو تمہیں انٹرسٹ نہیں ہے۔۔۔ آرٹ کے متعلق کیا خیال ہے؟“

اس نے ایک نظر اپنے ہاتھوں کو دیکھا، پچھپچھ لہوں میں دبا کر کچھ سوچ کر بولی ”میں اکثر اسکیبجڈ بناتی رہتی ہوں۔ دیکھاؤں آپ کو؟“

مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ مومو پہلی دفعہ کوئی بات میرے علم میں لائے بغیر کرتی رہی تھی، ورنہ وہ تو ہر کام مجھے بتا کر کرتی تھی۔

”اور تم نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔“ میں نے خفگی سے شکوہ کیا۔

”وہ بہت اچھے نہیں ہیں۔“ وہ جھینپ گئی۔

میں نے میز پر رکھا اخبار منہ کے آگے کر لیا۔ اس نے اخبار کھینچ لیا۔

”میں کوئی مائیکل اینجیلو نہیں بن گئی، جو آپ کو خبر نہیں ہوئی۔ میں نے صرف دو چار تصویریں بنائی ہیں، وہ بھی ماشاء اللہ اتنی بھیاںک ہیں کہ آپ مروت میں بھی تعریف نہیں کریں گے۔ اس لیے زیادہ خفا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ نے خفگی دکھائی تو پھر ٹھیک ہے!“ وہ بڑے بے نیاز انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی ”میں بھی نہیں دیکھاؤں گی۔“

اس کے اسٹائل پر مجھے ہنسی آئی ”اچھا جاؤ“ لے کر آؤ۔

”وہ بے نیازی ختم کر کے فوراً“ اندر بھاگی۔ چند لمحوں بعد دوبارہ نمودار ہوئی تو ہاتھ میں ایک کاپی تھی۔

”یہ۔۔۔ اتنے اچھے نہیں ہیں۔“ اس نے قدرے تذبذب سے کاپی میری جانب بڑھائی۔

وہ جنہیں دو چار تصویریں کہہ رہی تھی، وہ تقریباً 20 کے قریب تھیں اور بہت اچھی تھیں۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی کہ وہ اینجیلو ٹائپ کا آرٹ نہیں تھا، مگر اس کی عمر کے لحاظ سے اس نے کافی اچھا بنا لیا تھا۔

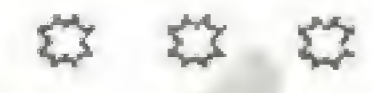
اس کی ہنسنے لگی دیکھ کر مجھے بے اختیار کچھ یاد آیا تھا۔

”یہ تو بہت اچھی ہیں مومو! بہت زیادہ، تم کوئی آرٹ اکیڈمی کیوں نہیں جوائن کر لیتیں؟“

میں نے اسے مشورہ دیا مگر اس کا ایسا ارادہ نہیں تھا۔

”سرا! ابھی میرا میٹرک تو ختم ہو جائے، یہ پینٹنگ وغیرہ تو

ساری عمر ہوتی رہے گی۔" اس نے بات ہی ختم کر دی۔
میں اس کے اندر کے مصوّر کو باہر نکالنا چاہتا تھا اس لیے میرے اصرار پر اس نے اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر اسکی بیچڑ بنانے شروع کر دیے۔ میں نے اسے کئی دفعہ کہا کہ وہ میرا کیچ بنائے مگر وہ ٹال جاتی۔



اس کے کیمسٹری کے پریکٹیکل سے پہچلی شام میں اس کی طرف معموس سے قدرے پہلے آگیا۔ پیپرزمیں میں اسے یوشن نہیں پڑھاتا تھا اس لیے اب کافی دنوں بعد آج آیا تھا کہ دیکھ لوں اسے کوئی مسئلہ نہ ہو۔ ویسے مجھے علم تھا کہ اس کو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ آج بھی ماضی پر نگاہ ڈالوں تو سوچتا ہوں کہ روزانہ شام کی وہ ایک گھنٹے کی یوشن تو محض ایک فارمبلسی تھی۔ ورنہ وہ زمانہ یوشنز کا ہرگز نہ تھا۔ مجھے اور مومو کو روز شام ایک گھنٹہ ایک ساتھ بیٹھنے کی اتنی عادت ہو گئی تھی کہ اب ہم بھولے سے بھی یوشن ختم کرنے کا نہیں سوچتے تھے۔
اود میں بھی بات کرتے کرتے کدھر نکل جاتا ہوں بوڑھا ہو گیا ہوں نا، بوڑھا یا انسان کو قدرے سکی کر دیتا ہے۔ اب تو یادداشت بھی نہیں رہی۔ اسی لیے کہاں سے کہاں نکل جاتا ہوں۔

خیر میں آپ کو مہر آسمان کی کہانی سنارہا تھا اور شاید اس کے کیمسٹری کے پریکٹیکل سے پہچلی شام کا تذکرہ کر رہا تھا۔
"سر۔۔۔! آپ اتنے دنوں بعد!" وہ کچن میں کرسی پر بیٹھی سیب کھا رہی تھی، مجھ پر نگاہ پڑتے ہی خوشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں بھئی، تیار رہی ہو مٹی پریکٹیکل کی؟" میں بے تکلفی سے کرسی کیچ کر بیٹھ گیا۔ "کاپی کمبلیٹ ہے؟ میڈم کے سائن کرائے ہیں؟"

"جی سر! سب کچھ کمبلیٹ ہے۔ آپ یہ سیب لیں نا!" سیبوں کی پلیٹ میری جانب کھسکا کر وہ فرنگ کی طرف بڑھی۔

"میں نے تو پیپرزم سے بھی پہلے سائن کرائے تھے۔" فرنگ میں سے انگوروں کا لفافہ نکالتے ہوئے وہ بتانے لگی۔
"رٹس گڈ!" میں نے سیب کی قاش منہ میں رکھی۔
تمام انگور اس نے نوکری میں ڈال کر سبک کے آگے رکھے اور پھر ان کو اچھی طرح دھو کر اور پانی منتھار کر میرے

سامنے میز پر رکھ دیے۔ اس کو علم تھا کہ میں سینب سے زیادہ انگور شوق سے کھاتا ہوں۔
"لیس نا، سر!" اس نے ایک صاف پلیٹ بھی میرے سامنے رکھی۔
"لیتا ہوں۔" تم زرا ایک دفعہ مجھے پریکٹیکل نوٹ بک دکھا دو، میں اپنی سلی کر لوں!" میں انگوروں کے گچھ سے انگور توڑنے لگا۔

"وہ تو سر۔" اس نے قدرے ہچکچاہٹ سے مجھے دیکھا۔
وہ صدف نے مجھ سے مانگ لی تھی اس کو کچھ ڈائیگرامز بنانی تھیں۔

"مومو!" میں نے بے چینی سے مومو کو دیکھا۔ "تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ تم نے کاپی صدف کو کیوں دے دی؟ کوئی پیپر سے پیچھے دن بھی کاپی دیا کرتا ہے؟" مجھے اس کی نرم دلی پر وہ کرغصہ آ رہا تھا "کل اگر وہ کاپی نہ لائی اور تمہارا کوئی سخت قسم کا انگریز امز لیا تو وہ تو تمہیں قیل کر دے گا۔" وہ لے آئے گی سر! اس بے چاری نے چند ڈائیگرامز بنانی تھیں۔

"سار اسال کیوں نہ بنائیں اس نے ڈائیگرامز؟"
"اس کی کوئی مجبوری ہوئی سر!" وہ منظم من تھی۔
"اور اگر وہ نہ لائی تو؟ تم کیا کرو گی پھر؟" مجھے اس پر بہت غصہ آیا تھا۔

مومو نے ایک لمحے کو خاموشی سے میرا چہرہ دیکھا پھر بولی "سر! جب اس نے کہا کہ وہ لے آئے گی تو وہ لے آئے گی۔ دنیا اتنی بھی بے اعتبار نہیں ہوتی، آپ یوں خوا خواہ ہر کسی پر شک نہ کیا کریں۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "شک؟ میں بھلا کب شک کرتا ہوں؟"

"سر! آپ اپنے علاوہ کسی کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے، آپ کو ہر بندے پر شک ہوتا ہے کہ وہ آپ کو دھوکا دے گا، حتیٰ کہ مجھ پر بھی۔" وہ بہت آرام سے انگور کھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اسی لیے کہہ رہی ہوں یوں شک نہ کریں وہ لے آئے گی۔"

مومو کی بات درست نکلی۔ وہ اس کی کلاس فیلو صدف واقعی ایگلے دن کاپی لے آئی۔ یہ ایک چھوٹی سی، غیر اہم بات تھی، مگر اس چھوٹی سی غیر اہم بات نے مجھ پر یہ انکشاف کیا کہ مجھے اس دنیا میں کسی پر اعتبار نہیں حتیٰ کہ مومو پر بھی نہیں۔



اس روز تو معجزہ ہی ہو گیا۔
صبح جب بچے کے قریب، جب میں اپنے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر موجود پارک میں پتھر تلی روش پر جا لنگ کر رہا تھا، مجھے سامنے سے مومو آئی دکھائی دی۔

"ہیلو سر!" میرے مخالف سمت سے آئی، بلیو جینز اور شرٹ میں ملبوس مومو نے ہاتھ ہلاتے ہوئے بھاگ کر میرا اور اپنے درمیان موجود فاصلہ طے کیا، پھر میرے ساتھ پیچ کر رخ اس طرف کر لیا جس طرف میں بھاگ رہا تھا۔

"وہ ٹیکم ہیلو لنل گزل!" میں اسے اپنے بائیں جانب بھاگتے دیکھ کر بے اختیار مسکرایا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم جا لنگ کرنے لگی ہو۔"

میری دائیں جانب گھاس پر چند لڑکے بیٹھے ایک سرساز کر رہے تھے، چند خواتین بھی معمول کے مطابق واک کر رہی تھیں، پارک میں روزانہ کی طرح رونق تھی مگر مجھے صحیح معنوں میں رونق آج لگی تھی، کیا مجھے وجہ بتانے کی ضرورت ہے؟

"صبح جلدی اٹھنا بہت مشکل کام ہے سر! مجھے نہیں لگتا کہ میں اسے جاری رکھ پاؤں گی۔" وہ ٹھوڑا سا فاصلہ طے کر کے ہی بانپ گئی تھی۔

"آپ کو اکیلے بھاگنا ہے تو شوق سے بھاگیں، ورنہ مجھے جوان کر لیں، وہ ایک بچ کی جانب بڑھتے ہوئے بولی تو میں بھی اس کے پیچھے آگیا۔

"تم میری رو میں خراب کر رہی ہو لڑکی! اتنی بیک ہو اور ایک چکر بھی نہیں لگایا اور میں تم سے عمر میں اتنا بڑا ہوں، پھر بھی روزہ سناں کے اٹھ چکر لیتا ہوں۔"

"ارے سر! بندے کا دل جوان ہونا چاہیے، عمر سے کیا ہوتا ہے۔" اس کے انداز میں لاپرواہی تھی، پھر تنفس بحال کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی "گھر جا رہی ہوں! کئی بی جانا ہے۔" وہ ان دنوں فرسٹ ایئر میں تھی۔

"یوں کرو، میرے گھر چلو اور کافی پیو۔" کاپی اور کتابوں کے معاملے میں میرا اور مومو کا ذوق ایک سا تھا۔

"یہ ٹھیک ہے!" واپسی پر ہم بھاگنے کے بجائے چل رہے تھے۔ اب وہ میرے دائیں جانب تھی۔ میں نے ایک نظر اس کو دیکھا، وہ مجھ سے کتنی چھوٹی، کتنی نازک سی تھی۔ اس کا سر میرے کندھے سے بھی نیچے آتا تھا۔

"ایک بات پوچھوں سر؟" قریب لگے ایک درخت کی نشی سے پتا توڑ کر دونوں ہاتھوں میں لیے وہ اس کے ٹکڑے کرنے لگی۔

"اجازت کیوں مانگ رہی ہو؟"
"اس لیے کہ کہیں آپ مائنڈ نہ کر جائیں۔" اس نے ایک گہری سانس بھری۔
"پوچھو۔"

"آپ کو نامہ آئی یاد ہیں؟"
میں نے نظر اٹھا کر حیرت سے اس غیر متوقع سوال پر اسے دیکھا۔ وہ پتے کے ٹکڑے کرتے ہوئے انہیں روش پر پھینک رہی تھی۔
"ہاں تھوڑی بہت!"

"سر! آپ نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ آپ نے منگنی کیوں توڑی تھی؟"
اس کا سر جھکا ہوا تھا اور نگاہیں پتے پر تھیں، جو اب تک آدھا رہ گیا تھا۔

"میں بہت امیر نہیں ہوں مومو اور میرے ہمراہی میں اس کی بہت سی خواہشات تشنہ رہ جاتیں۔ اس کے پاس مجھ سے بہتر خواہش تھی۔"

"یعنی اب آپ کے دل میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟" وہ ڈرتے ڈرتے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں اور ایسی بات سوچنی بھی نہیں چاہیے۔ وہ اب میری ہے۔"

"کل دادو نے مجھے بتایا کہ ان کے ہنرمند نے ان کے بچے چھین کر ان کو طلاق دے دی ہے۔"

"واٹ؟" میں نے رک کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔
"مگر کیوں؟"

"وہ ان کے کریکٹر پر شک کرتا تھا۔" مومو سر جھکائے ہتا رہی تھی، میرے کچے قدم چلے تو وہ بھی ساتھ چل دی۔
وہ اب واپس آگئی ہیں اب آپ؟"

"وہ چیبنر کلوز ہو چکا مومو! وہ ایک بے وفا عورت تھی اور ہے، میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر بے وفائی نہیں۔" میری بات پر اس نے بڑے ہلکے پھسکے انداز میں "اوکے سر!" کہہ دیا۔

پارک سے نکل کر مومو نے اپنے سائیکل کو ان لاک کیا، پھر دونوں ہاتھ اس کے ہینڈل پر رکھ کر اسے ساتھ چلاتے ہوئے پیدل میرے ہمراہ میرے گھر کی جانب چل پڑی۔

”آپ کی اس گھر کے ساتھ کوئی پرانی دشمنی چل رہی ہے کیا؟“ میرے لوٹک روم میں کھڑے ہو کر کافی دیر تک ارد گرد کا جائزہ لینے کے بعد اس نے بے حد معصومیت سے پوچھا تھا۔

لوٹک روم کے صوفوں کا کپڑا میلا ہوا تھا سینئر نیبل پر رات کے کھانے کے برتن جوں کے توں رکھے تھے۔ لوٹک روم سے ملحقہ اوپن کچن کے کاؤنٹر پر تویہ بھی پڑا تھا۔ میں نے قدرے شرمندگی سے اسے دیکھا۔

”سواری پھوٹی لڑکی انگریزوں کی رہا ہوں۔“ وہ لوٹک روم میں رکھے برتن اٹھا کر کچن میں بے سنگ میں رکھنے لگی۔

”میں ذرا چیخ کر آؤں تم بیٹھو۔“ اس کو وہیں چھوڑ کر میں آفس کے لیے تیار ہونے چلا گیا، تھوڑی دیر بعد نماز کو توڑ کر توڑے سے پانی رگڑتے ہوئے نکلا تو یکدم اپنے بند روم کی دہلیز پر رک گیا۔

لوٹک روم کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ تمام چیزیں سنبھلے سے رکھی تھیں۔ اینڈوڈور پلانٹس کو پانی دے کر ان کی جگہیں تبدیل کر دی گئی تھیں، میبلے برتن اب چمکتے دسٹے اپنی جگہ پر پہنچ چکے تھے۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا لوٹک روم میں آیا۔ مجھے مومو دائیں جانب کچن میں چولہے کے آگے کھڑی دکھائی دی تھی۔ آہٹ پر وہ مڑی ”آگے آپ؟ چلیں ناشتہ کر لیں۔“ اس نے چولہا بند کر کے فراسنگ پین سے تلے ہوئے انڈے پلیٹ میں نکالے، دو سری پلیٹ میں توں رکھے اور کافی کے دو بھاپ اڑاتے گلوں کے ساتھ سیلے سے ٹرے میں سجا کر لوٹک روم میں لے آئی۔

”یہ زیادہ شوگر والی آپ کی اور یہ کم شوگر والی میری۔“ مجھے میرا کپ تھا کروہ مزے سے بولی۔

”اتنی سی دیر میں تم نے یہ سب کیسے کر لیا؟“ میری حیرت پر وہ مسکرائی اور شانے اچکا دیے ”بس کر لیا۔“ اس روز بتائیں کتنے عرصے بعد میں نے زائے دار ناشتہ کیا تھا جو مزہ اور زائے دار مومو کے تلے ہوئے انڈے میں تھا، وہ مجھے پوری دنیا میں، سیون اسٹار ہوٹلز سے لے کر ڈرائیور ہوٹلز تک کہیں نہیں ملا تھا۔

اس کے بعد اکثر ہی وہ جاگنگ کے بعد میرے ساتھ گھر آ جاتی اور نہ صرف یہ کہ میرے لیے ناشتہ بناتی بلکہ کبھی کبھار تو پورے ہفتے کے کپڑے بھی استری کر جاتی۔ پہلے

کپڑے میں استری کرتا تھا، برتن خود دھوتا تھا۔ نوکر کبھی رکھے نہیں کہ ان پر بھروسہ نہ تھا، صفائی البتہ ہفتے میں تین دن سزکمال کی نوکرانی آ کر کر جاتی تھی۔ ورنہ تو میں کھانا بھی (بد مزہ ہی سہی) خود ہی بناتا تھا۔ لیکن پھر مومو نے میرا ہر کام یا محسوس انداز میں اپنے ذمے لے لیا وہ تو میرے پودوں تک کا خیال رکھتی تھی۔

اور پھر ایک دفعہ تو وہ ہفتے بھر کے لیے کسی شادی میں شرکت کرنے کے لیے کراچی چلی گئی۔ اس پورے ہفتے میں ’مومو پر بے حد انحصار کرنے کے بعد میں تو بالکل مفلوج ہو چکا تھا‘ کافی عرصے تک کچن سے دور رہنے کے باعث میں تو انڈے تلنا بھی بھول چکا تھا۔ میرے جوتے ’موزے‘ ٹائی، سب کچھ مومو رکھنے لگی تھی۔

اس ایک ہفتے میں مومو مجھے بہت یاد آئی تھی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ اس چھوٹی سی لڑکی کی میری زندگی میں کتنی اہمیت ہے، پھر بھی میں نے سوچا کہ اب وہ آئے گی تو اس سے کہہ دوں گا کہ میرے کام نہ کیا کرے، تاکہ میں اس کی غیر موجودگی میں مفلوج ہو کر نہ رہ جاؤں، مگر جب وہ ہنسی مسکراتی لڑکی واپس آئی، تو میں نے کچھ بھی کہنے کا ارادہ بدل ڈالا۔ اگر وہ میرا کام کر ہی دیتی تھی تو اس میں میرا فائدہ اور اس کی خوشی تھی، میں نے اسے مجبور تو نہیں کیا تھا۔ آخر میں بھی اسے یوشن پڑھا تھا۔ میرے اندر کے خود غرض انسان نے مجھے اس سے کچھ بھی کہنے نہ دیا۔



”مومو تو کچن میں حیدر کے لیے سوپ بنا رہی ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم بیٹھو، میں مومو کو بلاتی ہوں۔“

مجھے لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھ کر اتنی جو حیدر کے کمرے سے نکل رہی تھیں، شفقت سے مسکراتے ہوئے کہہ کر کچن کی جانب بڑھ گئیں۔

میں حیدر کے متعلق پریشان سا ہو کر اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ٹکیوں کے سارے آنکھیں موندے بستر پر نیم دراز تھا، دستک پر آنکھیں کھول دیں۔ مجھے دیکھ کر نقابت سے مسکرایا۔

”او حسان!“

”کیا حال بنایا ہے حیدر!“ میں تاسف سے اس کے پڑمڑہ اور کمزور چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کے بید کے قریب

نرسی بھیج کر بیٹھ گیا۔

”ارے کچھ نہیں، معمول سا بخار ہے، مگر میری والدہ محترمہ اور۔۔۔“ اسی پل ہاتھ میں ٹرے لیے مومو اندر داخل ہوئی تھی۔

اس کو دیکھ کر حیدر کے لبوں پر فخریہ مسکراہٹ بکھر گئی، اور مس مہر النساء نے ہوا بنا کر رکھ دیا ہے۔

”السلام، علیکم سر۔“ اس نے میز پر ٹرے رکھی اور جھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر پیالے اور چھوٹی سیٹ کرنے لگی۔ ”ہوا کسی نے نہیں بنایا یا! آپ بیمار ہیں اور مومو بہروں کے ساتھ ایسے ہی کرتی ہے!“

وہ بڑے من مائے انداز میں کہہ رہی تھی۔ اس کے بے بال شانوں پر بکھرے تھے، آج اس نے کڑھائی والی پوری آستین کا فیض شلوار پین رکھی تھی اور کندھوں پر لمبا سا دوپٹہ پھیلا یا ہوا تھا۔ آج وہ مجھے بڑی بڑی اور پہلے کی نسبت مختلف لگی تھی۔

”میری بیٹی بہت کیڑنگ ہے۔ جہاں جائے گی، جھینس اور خلوص بانٹے گی۔“ حیدر فخر سے اسے دیکھ رہا تھا۔

میں نے شرارت سے مسکرا کر مومو کو دیکھا۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح شرابی یا گھبرائی نہیں، بلکہ پورے اعتماد سے مسکراتی تھی۔

”ہماری مومو ہر معاملے میں بہترین ہے۔“ میں نے بھی حیدر کی تائید کی۔

مومو نے ایک پیالہ حیدر کو تھمایا، جس نے سیدھے ہو کر ٹیک لگائی اور دو سرایا لہ اس نے میری سائیڈ والی نیبل پر رکھا۔

میں نے ایک چھوٹی سوپ کالیا۔ اس میں سا سز کم تھے۔ ”خبا“ وہ حیدر کے لیے غذائی اعتبار سے بنایا گیا سوپ تھا۔ میں نے خاموشی سے دو سرا چھو لے لیا۔ حالانکہ میں تیز قسم کی چلی ساس ڈالنے کا عادی تھا۔

”یہ چلی ساس، سرا“ مومو نے چلی ساس کی بوتل چند لمحوں بعد مجھے لا کر دی، اور پھر خود ہی چند قطرے ڈال کر بوتل ٹرے میں رکھ دی۔ میں اسے بس دیکھ کر رہ گیا۔ پتہ نہیں اسے کسے ہر بات کا بغیر کسے علم ہو جاتا تھا۔

ہم دونوں کو سوپ سرد کر کے وہ حیدر کے سرہانے آ کر بیٹھ گئی۔ ”ایسا! ایک مشورہ دوں؟ آپ شادی کر لیں۔“

”مومو! حیدر کے لیے میں غفلت تھی۔“ ”پیا! کر لیں ناشادی، میری فرزند کی بڑی بہن ہے، سارا

اتنی کیوٹ اور سوئیٹ ہے، ماوہ اس کو ہر کام آتا ہے۔ آپ کے لیے پرفیکٹ ہے“ وہ بڑے جوش سے بتا رہی تھی۔ ”عمر کیا ہے؟“ حیدر نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے سوپ کا پیالہ سائیڈ پر رکھا۔

”تینا تین تین کی ہے؟“ مومو نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ جواب میں حیدر نے گھور کر اسے دیکھا۔ ”مس مہر النساء، بیمار میں ہوں، اور دماغ آپ کا چل گیا ہے؟“

”کیا ہوا یا؟“ وہ واقعی نہیں سمجھتی تھی۔ ”مہر النساء بی بی۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ حیدر اور مجھے جب بھی اسے چھیڑنا ہوتا، ہم اسے مہر النساء کہہ کر پکارتے تھے۔

”آپ ایک غلط بات کر رہی ہیں۔ وہ لڑکی انیس سال کی ہے اور آپ کے والد ماجد چالیسویں سن کو کراس کر چکے ہیں۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے مہر! بندے کا ذہن ملنا چاہیے۔“ ”بہت کچھ ہوتا ہے مومو! عمر سے ہی تو سب کچھ ہوتا ہے۔“ حیدر سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ”میں ایک شادی کر چکا ہوں، میری، ایک جوان بیٹی ہے، اگر ان لوگوں کو دولت کا لالچ نہ ہو تو وہ کیوں اس کی شادی مجھ سے کریں گے؟“

”پر آپ اتنے بیک لگتے ہیں اور آپ اتنے پنڈ سم بھی ہیں۔“ وہ بحث کرنے کے موڈ میں تھی۔ ”بیک لگتے اور پنڈ سم ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ عمروں کے فرق کبھی نہیں ملے، مومو!“ میں نے حیدر کی تائید کی۔

”ہمارے پیئر صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس برس کی عمر میں بہت کم عمر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شادی کی تھی اور وہ ایک مثالی شادی تھی۔“ اس کی بات پر میں لا جواب سا ہو گیا۔

”وہ اور بات تھی۔ میں اپنی بات کر رہا ہوں میری بات یاد رکھنا مومو، جو چیزیں خطرہ بن سکتی ہیں وہ ایک دن ختم ہو کر اپنی سابقہ پوزیشن پر آ جاتی ہیں۔“

حیدر کا اچھوٹا ٹوک تھا۔ مومو نے مدد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا، مگر میں نے شانے اچکا دیے۔ وہ مایوس سی ہو کر اپنے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔



میں اتوار کے روز مومو کو یوشن پڑھانے نہیں جاتا تھا،

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیش کش

(WWW.PAKSOCIETY.COM)

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے آپ کیلئے پیش کیا۔

ہم خاص کیوں ہیں؟؟؟؟

یہ واحد ویب سائٹ ہے جہاں سے تمام ماہنامہ ڈائجسٹ، ناول، عمران سیریز، شاعری کی کتابیں، بچوں کی کہانیاں، اور اسلامی کتابیں ڈائریکٹ ڈاؤن لوڈ کرنے کے ساتھ ساتھ آن لائن پڑھ بھی سکتے ہیں۔



fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

اگر آپ کو ویب سائٹ پسند آئی ہے تو پوسٹ کے آخر میں اپنا تبصرہ ضرور دیں۔

اپنا تبصرہ صرف پوسٹ تک محدود رکھیں۔ درخواست کے لئے رابطہ کا صفحہ استعمال کریں۔

اپنے دوست احباب کو بھی پاک سوسائٹی کے بارے میں بتائیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی انتظامیہ سے مالی تعاون کیجئے۔ تاکہ یہ منفرد ویب

سائٹ آپ کیلئے جاری رکھی جاسکیں۔

پاکستانیوں کے ویب سائٹ

WWW.Paksociety.Com



Library For Pakistan

گھر اس اتوار آئی نے بعد اصرار مجھے چائے پر انوائٹ کیا تھا۔ وہ مجھے کچھ لوگوں سے ملوانا چاہتی تھیں۔ میں پانچ بجے کے قریب وہاں چلا گیا۔

ڈرائنگ روم میں حیدر اور آنٹی کے علاوہ ایک خوش شکل مرد کے ہمراہ ایک خوبصورت سی ستائیس اٹھائیس سالہ لڑکی بیٹھی تھی۔

”یہ میرا کزن ہے حسان! ایک ماٹری نیٹل کمپنی میں کام کرتا ہے۔“ حیدر نے میرا تعارف ان سے کرایا۔ ”اور حسان! یہ میرا دوست اور بزنس پارٹنر برابر ریاض ہیں اور یہ ان کی بہن مس تانیہ ریاض ہیں۔ روٹیشن کے اعتبار سے آرکائیوٹ ہیں اور ہمارے اگلے پروجیکٹ میں ان کی خاطر خواہ مدد ہمارے ساتھ ہوگی۔“

میں نے ایک رسمی مسکراہٹ ان کی جانب اچھٹی دی مجھے ان سے ملاقات کا کچھ کچھ مقصد سمجھ میں آ رہا تھا اور یقیناً ”آپ کو بھی آ رہا ہوگا۔“

وہ لوگ جتنی دیر بیٹھے رہے، میں خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ جس صوفے پر حیدر بیٹھا تھا اس کے پیچھے دیوار کی جگہ قید اور فریج وینڈو تھی جس نے پوری دیوار کی جگہ گھیر رکھی تھی۔ کھڑکی کے شفاف شیشے کے اس پار مجھے لان دکھائی دے رہا تھا، مومو وہاں کھڑی حلیمہ کو کوئی کام کہہ رہی تھی۔ آج اس نے بہت پاری سی پنک کھڑکی شلوار قمیض پہن رکھی تھی، دیکھ کر اس دن کی نسبت چھوٹا تھا اور اگلے میں جھول رہا تھا۔ قمیض کے آستین بھی بہت چھوٹی تھی۔ جو اس پر بہت اچھی لگتی تھی۔

مہمانوں کے سامنے وہ چائے اور دیگر لوازمات سرو کرتے وقت ہی آئی۔ مجھے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس نے غلبا ”مجھے آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے سلام کر کے وہ فوراً اندر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد اس کی واپسی براؤنیز کی ایک پلیٹ کے ساتھ ہوئی۔

”میں نے بنا کر رکھی تھیں آپ کے لیے، مجھے پتہ نہیں تھا کہ آپ آئے ہوئے ہیں ورنہ پہلے لے آتی۔“ لڑکی میں میرے سامنے براؤنیز کی پلیٹ رکھتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا ”میں زریب مسکرایا۔“

آنٹی میرے قریب ہی بیٹھی تھیں، براؤنیز کی پلیٹ دیکھ کر انہوں نے مومو کو گھورا، وہ دوسری جانب دیکھنے لگی۔ آنٹی نے آہستہ سے مجھے مخاطب کیا ”کب سے کہہ رہی ہوں حلیمہ سے، براؤنیز بھی ساتھ لے آئے، مگر وہ کہہ رہی

تھی مومو بی بی نے براؤنیز کو ہاتھ بھی لگانے سے منع کیا ہے۔ اب سمجھ میں آیا، تمہارے لیے رکھی تھیں۔ مجھ سے پہلے پوچھ لیتی میری ماڈو، تمہارے سر کو تو سچ ہی میں انوائٹ کر چکی تھی۔“

اس نے براؤنیز صرف میرے لیے بنائی تھیں کیونکہ میں وہ بہت شوق سے کھاتا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”تھینک یو لنڈل گرل۔“ یہ پہلی بار تھا جب میں نے مومو کو تھینک یو بولا تھا، ورنہ ہمیشہ اس کی ہر خدمت کو میں فارگر انڈی لیتا تھا۔

میرے شکریے پر وہ مسکرائی۔ وہ لوگ چلے گئے تو حیدر بھی اٹھ گیا۔ اس کو کوئی ضروری کام تھا۔ حلیمہ برتن اٹھانے لگی۔ مومو قدرے تسلسل سے میرے اور آنٹی کے ساتھ بیٹھ گئی۔

حلیمہ چلی گئی تو آنٹی نے مجھے مخاطب کیا ”تمہیں تانیہ کیسی لگتی؟“

”ہوں۔۔۔ اچھی تھی۔“ میں نے گویا انجان بن کر کہا۔ ”تانیہ اور بابر چلی ہی میں پاکستان شفٹ ہوئے ہیں۔ بابر کالج کے زمانے سے حیدر کا دوست ہے۔ اس کے رشتے داروں میں تانیہ کے جوڑ کا کوئی لڑکا نہیں، بلکہ سچ کوں تو اس کے رشتہ دار خاصے لالچی واقع ہوئے ہیں۔ اس نے حیدر سے تانیہ کے رشتے کے لیے کہا تھا۔ میرے اور حیدر کے ذہن میں صرف تمہارا نام آیا تھا۔ بولو، تم کیا کہتے ہو؟“

میں نے لمحہ بھر کو سوچا۔ ”سوچ کر بتاؤں گا، ویسے لوگ اچھے ہیں۔“

”اچھے کیا بہت اچھے ہیں۔ کینیڈا میں ان کا گھر سین کے گھر کے قریب تھا۔“ آنٹی نے اپنی بھانجی سین کا نام لیا جو پچھلے کئی سالوں سے کینیڈا میں مقیم تھی ”سین بتاتی ہے، تانیہ بہت اچھی اور شریف لڑکی ہے۔ ایشیائی کھانوں میں ماہر ہے اور بہت کچڑ ہے۔ وہ تو رشتے کی بات سن کر اتنی خوش ہوئی، کہتی تھی، میرا کوئی بھائی نہیں ہے ورنہ میں تانیہ کو اس کے لیے مانگ لیتی۔ بیٹے بھی میرے چھوٹے ہیں۔ آپ حسان کے لیے لے لیں اسے۔“

میں بے اختیار مسکرایا۔ سین سے میرا براہ راست کوئی رشتہ نہیں تھا، وہ حیدر کی کزن تھی پھر بھی ہماری بات چیت ہوتی رہتی تھی۔

”کیسی سے ہیں؟“

”بالکل ٹھیک ہے، ماشاء اللہ دو بجے ہیں اس کے۔ ابھی صبح ہی میں اس کے شوہر نے بہت برا گھرایا ہے۔ مجھ سے کہتی ہے، ”آپ اور مومو میرے پاس آجائیں، میرا اتنے بڑے گھر میں بلی نہیں لگت۔“

”ارے نہیں آنی! مومو کو کینڈا مت لے کر جائیں، میں بالکل مفلوج ہو کر رہ جاؤں گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے مومو کو دیکھا، جو ہمارے سامنے والے صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہ میری بات پر مسکرائی نہیں، بس بہت خاموش نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی بھنویں تنی ہوئی تھیں اور وہ بالکل چپ تھی۔

”میں ذرا کچن کو دیکھوں۔“ آنٹی کسی کام کو یاد کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ان کے جانے کے بعد میں نے مومو کو دیکھا۔ وہ بالکل اسی طرح مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے کچھ الجھن ہوئی۔

”مومو!“

”تو آپ داد کو سوچ کر تائیں گے اور۔۔۔ آپ کو وہ لوگ اچھے لگے ہیں!“ وہ ایک دم بہت کٹ دار لہجے میں بولی اس کی آواز میں دبا دبا غصہ تھا۔

”تانیہ اور باہر کی بات کر رہی ہو؟“ مجھے اس کے رویے پر حیرت ہوئی۔

”تو آپ داد کو سوچ کر تائیں گے“ وہ اسی دھونوک انداز میں بوجھ رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے مومو؟“ میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

”تو آپ شادی کر رہے ہیں؟“ اس کی آواز میں غصہ بھی تھا اور صدمہ بھی ”ہاں کر لی تو ہے نا! تو کر رہا ہوں مگر تمہیں کیوں غصہ آ رہا ہے؟“ میں اس کے رویے کی وجہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

”گنتی ہی درود زخمی لگا ہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔“ سرا

سرا! آپ کو وہ لڑکی نظر آگئی، جس کو آپ جانتے تک نہیں اور۔۔۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھگ گئے تھے ”اور ساڑھے پندرہ برس سے مومو کہیں نظر نہیں آئی آپ کو؟“

آج آپ مجھے چھوڑ کر کسی اور سے شادی کر رہے ہیں؟“ میرا دماغ بھگ سے اڑ گیا۔

”مومو!“ میں اتنی زور سے گرجا ”اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گچوں پر لڑھکنے لگے تھے۔“

”تمہارا۔۔۔ تمہارا دماغ درست ہے؟ تمہیں پتہ ہے تم

نے کیا بات کی ہے؟“ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”مجھے پتہ ہے، میں نے صرف یہی کہا ہے کہ آپ مجھے چھوڑ کر اس تانیہ ریاض سے شادی کیوں کر رہے ہیں؟ کیا وہ مجھ سے بہتر ہے؟“ اس کا لہجہ شاکا تھا۔

وہ اتنی آسانی سے وہ بات کر رہی تھی، جس کا تصور میں نے خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔

”شٹ اپ مومو! جسٹ شٹ دی ہیل اپ!“ میں نے بے اختیار دروازے کو دیکھا ”اگر کسی نے تمہاری بکواس من کی تو۔۔۔؟“ میرے خدا میں ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا، اور تم۔۔۔ وہ گاڈ!“ یہی بھنی ”صدہ“

استعجاب کے مارے میرے منہ سے کچھ نکل ہی نہیں رہا تھا۔

”ایسا کیا کہہ دیا ہے میں نے؟ آپ مجھے ساڑھے پندرہ سالوں سے جانتے ہیں، میرے کان میں اذان آپ نے دی تھی سرا! آپ تو مجھ سے واقف ہیں۔ آپ نے تو کہا تھا، آئی لوو مومو! اور اب؟“ اس کی آنکھوں سے آنسو ایک دفعہ پھر گرنے لگے تھے ”اور اب کیا میں اتنی بری ہوں کہ آپ مجھ سے شادی نہیں کر سکتے؟“

”بات برے اور اچھے کی نہیں ہے مومو! میں بھلا کیسے تم سے شادی کر سکتا ہوں؟ گاڈ!“ مجھے وہ فقرہ کہتے ہوئے بھی برا لگ رہا تھا۔ ”ہمارے درمیان ایک نیچر اور اسٹوڈنٹ سے بڑھ کر کوئی ریلیشن نہیں اور مجھے تم سے بہت محبت ہے مگر ایک چھوٹی سی درست کی طرح لیکن تم نے اتنی بڑی بات کہہ دی بغیر کچھ سوچے مجھے۔ اگر حیدر کو علم ہو گیا تو۔۔۔ تم جانتی ہو، میں تمہارے باپ کی جگہ ہوں۔“

وہ ایک دم کھڑی ہو کر میرے سامنے آئی ”باپ کی جگہ؟“ اس نے غصے سے کہا تھا ”کیا کہا آپ نے؟ آپ میرے باپ کی جگہ ہیں؟ ان ساڑھے پندرہ برسوں میں کب آپ نے مجھے پنا کہا؟ کب مجھے ”مائی چائلڈ“ کہہ کر مخاطب کیا؟ کب کہا کہ میں تمہارا باپ ہوں؟ آپ میرے باپ ہیں نہ باپ کی طرح ہیں، باپ صرف ایک ہوتا ہے، جو میرا آں ریڈی ہے۔“

”استار بھی باپ ہوتا ہے مومو!“ میں ڈپٹ کر بولا مگر وہ اسی انداز میں میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مجھ سے مخاطب تھی۔ ”بہت سے نیچرز اور اسٹوڈنٹس آپس میں

شادی کر لیتے ہیں، تو کیا دنیا ادھر سے ادھر ہو جاتی ہے؟ نہیں بابہ منہ بولے رشتے کچھ نہیں ہوتے اور ہمارے درمیان تو کوئی منہ بولا رشتہ ہے بھی نہیں۔“

”تم۔۔۔“ شدید صدمے اور بے یقینی کی حالت میں، میں منھیاں بھیج کر رہ گیا ”تم پاگل ہو گئی ہو۔ اتنی مولی مولی کتابیں پڑھ کر تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ تمہاری عمر ہے شادی کی بات کرنے کی؟ افسانوں اور ناولوں نے تمہارے ذہن میں فتور ڈال دیا ہے۔ اپنی عمر دیکھو اور اپنی باتیں دیکھو۔ تم تو سولہ برس کی بھی نہیں ہوئی ہو اور میں تم سے بائیس سال بڑا ہوں۔“

”عمر سے کچھ نہیں ہوتا، سرا!“ اس نے دائیں ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھے۔

”بہت کچھ ہوتا ہے، تم الیکٹرک پکلیکس کا شکار ہو۔“

”الیکٹرک پکلیکس؟ وہ کیا ہوتا ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ایک چھوٹی سی نفسیاتی بیماری جو کچھ لڑکیوں میں ہوتی ہے۔ دراصل یہ ایک لڑکی کا، اس کی ماں سے حسد کا نام ہے۔“

”ماں سے۔۔۔ حسد؟“ اس نے خائف سی ہو کر مجھے دیکھا ایک دم مجھے احساس ہوا، مومو نے تو ماں کو دیکھا ہی نہیں تھا۔

”دراصل جو لڑکیاں ذہنی طور پر جلدی میچور ہو جاتی ہیں نا کے اندر فغنی پلس مردوں کے لیے ایک پسندیدگی ڈیولپ ہو جاتی ہے۔ وہ بڑی عمر کے مردوں میں بیک وقت محبوب اور باپ دونوں کو تلاش کرتی ہیں۔ ایسی لڑکی کی شادی اگر اس کی عمر کے لڑکے سے کر دی جائے تو وہ ذہنی سطح پر ملنے کے باعث ناکام ہو جاتی ہے۔“

الیکٹرک پکلیکس ادھر ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ جب وہ لڑکی میں پچیس برس کی عمر کو پہنچتی ہے تو معاملہ الٹ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے سے آدھی عمر کے لڑکوں میں دلچسپی لینا شروع کر دیتی ہے۔ تم نے ضرور آئیٹوں ٹائپ خوابوں کو بک سے سیکرٹری رکھ کر ان کے آگے پیچھے پھرتے دیکھا ہو؟ تو یہی الیکٹرک پکلیکس ہوتا ہے۔“

وہ بکا بکا سی میری جانب دیکھ رہی تھی۔

”تو آپ، آپ مجھ سے شادی نہیں کریں گے؟“

”بھئی بھئی شادی!“ میں چکر اکر رہ گیا۔ ”میں مر کر بھی تم سے شادی نہیں کر سکتا، میرا تمہارا کوئی جوڑ نہیں یا اللہ!

میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“ دکھ کے مارے مجھ سے کچھ بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

”میں تو سمجھتی تھی آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔“ اس کی لابی پکلیکس ایک دفعہ پھر بھگ گئیں ”جیسے میں آپ سے کرتی ہوں۔“

”بچوں والی باتیں مت کرو مومو! جس کو تم محبت سمجھ رہی ہو وہ صرف ایک وقتی اور جذباتی انریشن ہے۔ ذرا بڑی ہوگی تو تمہیں اس فضول اور احمقانہ خیال پر ہنسی آئے گی۔“ میرا لہجہ غصیلا اور بے حد روکھا تھا۔

”آپ میری محبت کو فضول اور احمقانہ کہہ رہے ہیں۔“ اس نے دکھ سے میرا چہرہ دیکھا۔

”یہ محبت نہیں ہے مومو! یہ جذباتی انریشن ہے۔ تمہیں بڑی عمر کا مرد اچھا لگتا ہے، کیونکہ تمہیں باپ کی محبت نہیں ملی۔ سارا قصور ہی حیدر کا ہے۔ اس نے تمہیں کبھی محبت دی ہی نہیں۔ اس لیے تم اپنے باپ کی عمر کے ہر آدمی میں اپنا باپ تلاش کرتی ہو۔۔۔ جانتی ہو میں روز تمہارے پاس کیوں آتا تھا؟ کیونکہ میں دیکھتا تھا حیدر تمہیں اگڑا کر رہا ہے۔ میں چاہتا تھا تمہاری ذات میں کہیں کوئی کی کوئی خلش نہ رہ جائے، اس لیے میں تمہیں توجہ دیتا تھا مگر تم نے کتنا الٹا مطلب لیا میری محبت کا، مومو! تم نادان ہو اور تم بے وقوف ہو۔“

”ہاں میں ہوں، میں نادان ہوں، میں بے وقوف ہوں،“

حکم میں نے اس دنیا میں سب سے زیادہ آپ سے محبت کی ہے۔ آپ سے سرا! لیکن۔۔۔ لیکن آپ کے خیال میں، میں نفسیاتی مریض ہوں۔“

وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے سر کو تھامے صوفے پر گر سی گئی۔

”آپ کو میں ذہنی بیماریوں کا شکار لگتی ہوں۔ میری آپ کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔“ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے ”آپ کو میں ہمیشہ غلط اور جھوٹی لگتی ہوں۔“ اس نے سر اٹھا کر آنسوؤں سے لبریز شکوہ کناں آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

”مجھے پچھتاوا ہو رہا ہے کہ کیوں میں نے ساڑھے پندرہ برس تم پر ضائع کیے۔“ میری بات پر وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

”تم ایسی نکلو گی، کاش مجھے علم ہوتا۔ آئی ہیٹ یو مومو۔“

میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔“ میں نے میز سے چابی

میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“ دکھ کے مارے مجھ سے کچھ بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

”میں تو سمجھتی تھی آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔“ اس کی لابی پکلیکس ایک دفعہ پھر بھگ گئیں ”جیسے میں آپ سے کرتی ہوں۔“

”بچوں والی باتیں مت کرو مومو! جس کو تم محبت سمجھ رہی ہو وہ صرف ایک وقتی اور جذباتی انریشن ہے۔ ذرا بڑی ہوگی تو تمہیں اس فضول اور احمقانہ خیال پر ہنسی آئے گی۔“ میرا لہجہ غصیلا اور بے حد روکھا تھا۔

”آپ میری محبت کو فضول اور احمقانہ کہہ رہے ہیں۔“ اس نے دکھ سے میرا چہرہ دیکھا۔

”یہ محبت نہیں ہے مومو! یہ جذباتی انریشن ہے۔ تمہیں بڑی عمر کا مرد اچھا لگتا ہے، کیونکہ تمہیں باپ کی محبت نہیں ملی۔ سارا قصور ہی حیدر کا ہے۔ اس نے تمہیں کبھی محبت دی ہی نہیں۔ اس لیے تم اپنے باپ کی عمر کے ہر آدمی میں اپنا باپ تلاش کرتی ہو۔۔۔ جانتی ہو میں روز تمہارے پاس کیوں آتا تھا؟ کیونکہ میں دیکھتا تھا حیدر تمہیں اگڑا کر رہا ہے۔ میں چاہتا تھا تمہاری ذات میں کہیں کوئی کی کوئی خلش نہ رہ جائے، اس لیے میں تمہیں توجہ دیتا تھا مگر تم نے کتنا الٹا مطلب لیا میری محبت کا، مومو! تم نادان ہو اور تم بے وقوف ہو۔“

”ہاں میں ہوں، میں نادان ہوں، میں بے وقوف ہوں،“

حکم میں نے اس دنیا میں سب سے زیادہ آپ سے محبت کی ہے۔ آپ سے سرا! لیکن۔۔۔ لیکن آپ کے خیال میں، میں نفسیاتی مریض ہوں۔“

وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے سر کو تھامے صوفے پر گر سی گئی۔

”آپ کو میں ذہنی بیماریوں کا شکار لگتی ہوں۔ میری آپ کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔“ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے ”آپ کو میں ہمیشہ غلط اور جھوٹی لگتی ہوں۔“ اس نے سر اٹھا کر آنسوؤں سے لبریز شکوہ کناں آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

”مجھے پچھتاوا ہو رہا ہے کہ کیوں میں نے ساڑھے پندرہ برس تم پر ضائع کیے۔“ میری بات پر وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

”تم ایسی نکلو گی، کاش مجھے علم ہوتا۔ آئی ہیٹ یو مومو۔“

میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔“ میں نے میز سے چابی

انٹائی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ غصے، دکھ اور اضطراب سے میری عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اگر حیدر کو اس کی باتوں کا علم ہو گیا تو کیا ہو گا؟ یہ سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹا جاتا تھا۔ میں نے ہمیشہ ایک استاد بن کر، ایک رہبر اور راہنما بن کر اس کے ساتھ برتاؤ کیا تھا اور وہ اس قسم کے خیالات پال لے گی، میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

پورچ کے قریب پہنچ کر ایک لحظہ کو رک کر میں نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کو دیکھا۔ قد آور کھڑکی کے شیشے کے اس پار مجھے مومو صوفے پر بیٹھی واضح دکھائی دے رہی تھی ڈرائنگ روم کی چیمٹ سے لٹکتے فانوس کی زرد روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔

اس کا دہپہ کندھے سے لڑھک کر نیچے گر چکا تھا۔ زرد روشنی میں اس کے دور حیا بازو زرد لگ رہے تھے۔ اتنی دور سے بھی مجھے اس کا قدرے جھکا ہوا آنسوؤں سے تر چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس چہرے پر اتنا دکھ اور کرب تھا، میرا دل چاہا۔ میں رک جاؤں اور واپس جا کر اسے سمجھاؤں۔ اس روٹی ہوئی چھوٹی سی لڑکی کو چپ کراؤں۔ اس کو پہلی بار میں نے اس بری طرح سے روتے دیکھا تھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں کسی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ اپنی عزت نفس اور اٹا کھونے کے بعد اس نے مجھے بھی کھو دیا تھا۔ وہ اندر سے ٹوٹ رہی تھی، اس کے آنسوؤں میں مجھے اس کی ٹوٹی بکھرتی ذات کی کرجیاں نظر آرہی تھیں۔ اسے میں نے بہت رلایا تھا، بہت دیکھی کر دیا تھا مگر اس نے مجھ سے میرے حوصلے سے زیادہ مانگ لیا تھا۔ اس نے ناممکن بات کر دی تھی۔

میں اس کو چپ کراتا چاہتا تھا۔ اس کے آنسو پونچھتا چاہتا تھا، مگر۔ میں نے سوچا میں اسے رو تا چھوڑ کر چلا آیا۔

اس رات میں سو نہیں سکا۔ تمام رات بے چینی و اضطراب سے بستر کرو میں بدلتے زورے۔ مجھے صوفے پر بیٹھی بالوں میں انگلیاں پھنساے وہ روٹی ہوئی چھوٹی سی لڑکی یاد آرہی تھی اور مجھے پتہ تھا وہ بھی پوری رات نہیں سوئی ہوگی۔ صرف مومو کو میرے دل کی بات نہیں پتہ چل جاتی تھی۔ مجھے بھی کبھی کبھی اس کے دل کا حال پتہ چل جاتا تھا۔

صبح اٹھ کر میں نے فیصلہ کر لیا۔ فرار کا فیصلہ پتا نہیں یہ کس سے فرار تھا؟ خود اپنے آپ سے یا مومو سے؟ میں نے اپنا بیگ تیار کیا، آفس سے چھٹی لی اور آفس کے ایک ملازم سلطان کو گھر کی نگرانی کے لیے چھوڑ کر کراچی چلا آیا۔

میں کتنے دنوں کے لیے آیا تھا مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ بس اتنا پتہ تھا کہ میں پیچھے کوئی بھی کنسبکٹ نمبر چھوڑے بغیر بھاگ رہا تھا۔

کراچی سے میں نادر ن ایریا ز چلا گیا۔ کتنے ہی بھٹے میں پہاڑوں اور چشموں کی خاک چھانتا رہا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر اور دوسرے سے تیسرے میں نے وہ تمام خوب صورت مقامات دیکھ لیے جو آج اپنی خوب صورتی کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اس وقت وہ بہت ہی غیر ترقی یافتہ تھے۔ سڑکیں خراب اور سہولیات ناپید تھیں، پھر بھی میں مگر مگر گھومتا رہا۔

چار ماہ گزر گئے میں گھر واپس نہیں گیا، نہ ہی وہاں فون کر کے حالات پتا کیے۔

پھر پانچواں مہینہ شروع ہونے سے قبل میں تھک ہار کر واپس اسلام آباد چلا آیا۔

واپس آیا تو گھر بہت اجڑا اجڑا سا لگا۔ سلطان صفائی کرتا دیتا تھا مگر اوپر اوپر سے دل سے نہیں۔ دل سے اور دل لگا کر تو میری چیزوں کا خیال صرف مومو رکھتی تھی۔ "سامان نکال لاؤ۔" گاڑی کی چابی سے ڈگی کھول کر سلطان کو ہدایت دیتے ہوئے میں اندر آیا۔ لوٹنگ روم میں رکھے ان بڑے پلاٹس مرچھا سے گئے تھے

میں نے کوٹ اتار کر صوفے پر پھینکا۔ میں بہت تھک چکا تھا۔ آخر کتنا بھاگ سکتا تھا مومو سے؟ بھاگنے سے بہتر تھا، میں اس کے پاس جاؤں اور اسے سمجھاؤں، یا پھر یوں ظاہر کروں جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ یقیناً چند دنوں میں اپنی اس نادانی کو بھول جائے گی اور ہماری زندگی ویسی ہی ہو جائے گی روتیوں کی بے ساختگی تو واپس نہیں آسکتی تھی مگر بہر حال میں یہ فیصلہ کر کے ہی لوٹا تھا۔

"بڑے دن لگا دیے آپ نے صاب!" سلطان میرا برا والا بیگ اٹھا کر اندر آگیا۔

"کوئی آیا گیا؟" میں فریج کی جانب بڑھتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھنے لگا۔

"ہاں جی، وہ انہوں نے۔" اس نے جیسے دماغ پر زور دیا۔ "بھلا سامان تھا، پتہ نہیں، یاد ہی نہیں رہا۔ مگر انہوں نے جی آپ کے جانے کے دو ماہ بعد تک روز شام صبح ادھر کے چکر لگائے تھے، پتہ نہیں جی کیا مسئلہ تھا ان کے چہرے پر بڑی پریشانی تھی، میں انہیں ہر بار بتاتا کہ صاحب کے آنے کا کچھ پتا نہیں ہے، پھر بھی وہ۔۔۔"

"کوئی پیغام دیا تھا اس نے؟" میں نے آکر اس کی بات کاٹی۔

"ہاں۔۔۔ دو ماہ پہلے، جب انہوں نے آخری چکر لگایا تھا تو ایک کاغذ دیا تھا۔ لیکن ایک زبانی پیغام بھی بہت بار دیا تھا کہ آپ کا فون آئے تو بتاؤں، مگر جی آپ کا فون ہی نہیں آیا، اس لیے۔۔۔"

"کیا پیغام دیا تھا؟" میں نے پانی کی بوتل لیوں سے ہٹاتے ہوئے قدرے بے چینی سے استفسار کیا۔ پتہ نہیں مومو نے میرے لیے کیا پیغام چھوڑا تھا۔

"وہ جی انہوں نے کہا تھا کہ آپ کو بتاؤں" میں نے باہر صاحب کو اپنی بیٹی کی وجہ سے انکار کر دیا ہے۔ اتنی بار انہوں نے مجھے بتایا کہ مجھے یاد رہی گیا۔"

میرے ہاتھ سے پانی کی بوتل چھوٹے چھوٹے پھینچ گئی۔

"کون؟ حیدر۔۔۔ حیدر آیا تھا؟ صبح شام ادھر حیدر آتا رہا تھا؟" میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے سلطان کو دیکھ رہا تھا۔

"ہاں جی۔۔۔ یہی نام تھا ان کا۔"

میرے قدموں سے آہستہ آہستہ زمین سرک رہی تھی "کوئی۔۔۔ کوئی لڑکی نہیں آئی؟"

"نہ جی لڑکی تو کوئی نہیں آئی۔ وہی حیدر صاحب آئے تھے ایک خط دے گئے تھے پھر اس کے بعد نہیں آئے۔"

دو ماہ بعد وہ خط لے آیا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ خط کھولا۔ وہ حیدر کی ہینڈ رائٹنگ تھی۔

"حسان! دو ماہ پہلے مومو میرے پاس آئی تھی جس روز میں نے تمہیں باہر سے ملوایا تھا، اس رات وہ میرے پاس آئی تھی اور جانتے ہو، وہ رو رہی تھی، حسان! میری بیٹی رو رہی تھی۔ میری مہر افساء رو رہی تھی۔"

جانتے ہو اس نے مجھ سے کیا کہا؟ اس نے کہا "آپ نائیہ آنٹی کو انکار کر دیں میں نے ہمیشہ خود کو سر کے ساتھ

دیکھا ہے، مجھے سر سے الگ مت کریں۔" اور اس نے یہ بھی کہا "آپ بہت برے ہیں بابا، آپ اپنی مومو سے اس کی سب سے قیمتی شے چھین رہے ہیں۔"

وہ رو رہی تھی حسان! اس نے روتے پلکتے زندگی میں پہلی بار مجھ سے کچھ مانگا تھا۔ میں اپنی مومو کو کیسے انکار کر سکتا ہوں؟ میں اسے انکار کر رہی نہیں سکا، مجھے میری مومو بہت پیاری ہے۔

وہ کہتی ہے سر کہتے ہیں میں پاگل ہوں۔

حسان! میری بیٹی پاگل نہیں ہے۔ تمہارے معاملے میں وہ ہمیشہ سے ایسی ہے۔ جب اس نے 8th کلاس میں پوزیشن لی تھی تو میں نے اسی روز اسے گولڈ کے ٹاپس دیے تھے۔ وہ خوش ہوئی تھی، مگر اس نے وہ ٹاپس کبھی نہیں بنے۔ پھر دوسرے میں تم آئے اور تم نے اسے گھڑی دی وہ اتنی خوش ہوئی، تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس نے اپنی پوری کلاس میں اپنا شاندار رزلٹ کارڈ نہیں، بلکہ وہ گھڑی دکھائی تھی وہ گھڑی آج بھی اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ پھول آج بھی اس کی کتابوں میں محفوظ پڑے ہیں اور تم کہتے ہو، میری مومو پاگل ہے؟

وہ کہتی ہے سر کہتے ہیں، تمہیں حیدر پیار نہیں کرتا۔

حسان! میں تو اسے ہمیشہ سے پیار کرتا ہوں۔ تم کتنا جانتے ہو میرے اور مومو کے ریلیشن کے بارے میں؟ تم روز صرف ایک گھنٹہ ہمارے گھر آتے ہو، صرف ایک گھنٹہ اس لیے تمہیں علم نہیں ہے کہ میں اور مومو روز رات بارہ ایک بجے تک بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں، اس کو گڈ نائٹ کہہ کر میں اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔ مومو جانتی تھی، تم یہ سمجھتے ہو۔ اس کے دل میں کیس نہ کہیں یہ خوف تھا کہ تم اس کو محبت اور توجہ بھی اسی لیے دیتے ہو اسی لیے اس نے کبھی تمہاری غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مومو اندر سے بہت بزدل لڑکی ہے، وہ بہت سے لوگوں کو بہت ساری باتیں اس ڈر سے نہیں بتاتی کہ کہیں وہ اس سے محبت کرنا چھوڑ دیں، ورنہ میں نے تو سونیا سے بھی زیادہ محبت مومو سے کی ہے اور جانتے ہو، اس رات وہ رو رہی تھی۔ میری سونیا، میری مہر افساء رو رہی تھی۔

میں باب ہوں، میری مجبوری کو سمجھو میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کو اس کے سر سے الگ نہیں کروں گا۔ میں روز تمہارے گھر کے چکر لگاتا ہوں، مگر تم بھاگ رہے ہو، تم مومو اور حیدر سے بھاگ رہے ہو۔ اگر تم نے

فرار ختم نہ کیا تو مومو کچھ بہت غلط کر ڈالے گی اور میں اسے روک بھی نہیں سکوں گا۔
واپس آ جاؤ حسان میں مومو کو روکتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

حیدر
میں نے اس خط کو اتنی دفعہ پڑھا کہ اس کے الفاظ میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے۔ مجھے لگا مومو میرے سامنے صوفے پر بیٹھی ہے۔ اس کی کنیاں اس کی گود میں رکھے کشن پر ہیں، اس کے آرنسنگ ہاتھوں کی خوب صورت انگلیاں اس کے بالوں میں پھنسی ہیں، اس کے آنسوؤں سے تر چہرے پر فانوس کی زرد روشنی پڑ رہی ہے اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔
میں ایک دم بے چین سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اگر حیدر اسے روٹا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا تو حسان بھی اسے روٹا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے زندگی میں سب سے زیادہ محبت مومو سے کی تھی مگر میں اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے نزدیک یہ ایک غیر فطری بات تھی۔

”میں اسے منالوں گا، میں حیدر کو بھی سمجھا لوں گا۔“
یہی سوچ کر میں اٹھ کھڑا ہوا مجھے لگا شاید وہ ابھی تک اپنے ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھی رو رہی ہو۔
اسی وقت گاڑی تیز رفتاری سے دوڑاتے ہوئے بہت سی امیدیں اور خدشات لے کر میں مومو کے گھر گیا تھا۔ اس کے گیٹ کے باہر ایک جھنگ سے میں نے گاڑی روکی اور باہر نکل کر بے یقینی سے گیٹ پر لگے تالے کو دیکھا۔
دباں ہلا کیوں لگا تھا؟

میں نے بے اختیار نکل بجائی اور پھر بجاتا چلا گیا، مگر کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ زمین اور آسمان میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے تھے۔ حیدر مومو آئی سب کدھر چلے گئے تھے؟

جب جھنجھٹی پر کسی نے دروازہ نہ کھولا تو میں نے گیٹ ہاتھوں سے بجانا شروع کر دیا۔

”مومو... مومو!“ میں اسے آوازیں دے رہا تھا، مگر وہ نہ آئی گیٹ پیٹنے کی آواز سن کر ساتھ والے گھر سے مسز ہاشمی کی بڑی ہونٹیں آئیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ سا ہوا۔

”حیدر اور اس کے گھر والوں کے بارے میں کچھ علم ہے آپ کو؟ میں کافی عرصے بعد آیا ہوں یہ سب کدھر

چلے گئے ہیں؟“

”حیدر صاحب کی تو ڈیوٹی ہو چکی ہے۔“

میں گرنٹ کھا کر پیچھے ہٹا تھا۔ کسی نے میرے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔

”کک... کیا کہا آپ نے؟ حیدر کی ڈیوٹی؟“ مجھے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ یقیناً کوئی بھیانک خواب تھا مجھ پر کیسے مر سکتا تھا؟

”دو مہینے پہلے انہیں دل کی تکلیف ہوئی تھی، ایسویٹس انہیں اسپتال لے کر جا رہی تھی کہ راستے میں ایک سیدنٹ ہو گیا۔ وہ موقع پر ہی ایکسپائر ہو گئے تھے۔“ وہ تاسف سے بتا رہی تھیں۔

میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ میرا دوست، میرا کزن، میرا حیدر، جو مجھ سے اپنی بیٹی کی خوشیاں مانگنے پر روز میرے گھر آتا تھا، جو کہتا تھا میں مومو کو روٹے نہیں دیکھ سکتا، وہ حیدر اب نہیں رہا تھا وہ مر گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”اور ان کی بیٹی اور والدہ؟“ کتنی ہی دیر بعد میں بولا تو مجھے اپنی آواز کسی گہری کھالی سے آتی سنائی دی تھی۔

”وہ تو چلے گئے۔“

”چلے گئے؟ کدھر چلے گئے؟“ مجھے لگ رہا تھا میں پاگل ہو جاؤں گا۔

”ان کی والدہ کی کوئی بھانجی آئی تھیں کینیڈا سے، وہ ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر کینیڈا چلی گئیں۔ ابھی کل ہی گئے ہیں وہ لوگ۔“

”وہ واپس... واپس کب آئیں گے؟“ کسی امید کے تحت میرے لبوں سے نکلا تھا۔

”واپس تو نہیں آئیں گے، وہ تو ہمیشہ کے لیے چلے گئے ہیں۔“

میں تھکے تھکے قدموں سے اپنی گاڑی کی جانب پلٹ آیا۔ میرا دماغ درد سے پھنسا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے... سب کچھ جیسے خواب کی سی کیفیت میں ہو رہا تھا۔

میرے پیچھے اتنا کچھ ہو گیا اور میں بے خبر رہا میں اتنا سنبھل تو نہیں تھا، اور مومو وہ چلی گئی؟ وہ کیوں چلی گئی؟ میں کیسے رہوں گا مومو کے بغیر؟

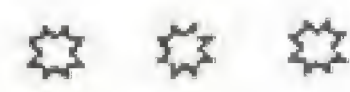
محبت تو میں نے اس سے بہت کی تھی، مگر میں احساس کمتری میں مبتلا تھا۔ اپنی بڑھتی عمر کے احساس کمتری میں

بمبتلا تھا۔ اپنی بڑھتی عمر کے احساس کمتری میں، میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگ ہم پر نہیں ہمارا مذاق اڑائیں میں ڈرتا تھا، میں بزدل تھا مومو کو میں نے اس وقت کہا تھا کہ ”میں تو ایسا تصور بھی نہیں کر سکتا، مگر میں نے ایسا تصور کیا تھا، میرے دل میں بھی چور تھا۔ اگر چور نہ ہوتا تو میں بھاگتا کیوں؟“

اور حیدر... اس نے جان دے دی؟ اسے دل کی تکلیف کب سے شروع ہوئی تھی؟ اس رات سے جب اس نے اپنی بیٹی کو روٹے دیکھا تھا، یا پھر اس روز سے جب وہ میری جانب سے مکمل طور پر مایوس ہو چکا تھا؟

مومو ٹھیک تھی، میں غلط تھا، وہ صحیح کہتی تھی کہ میں اس سے کسی ہی محبت کر رہا تھا، جیسے وہ مجھ سے کرتی تھی، مگر میں عدم تحفظ کا شکار تھا بزدل اور خود غرض اور سب لوگوں کی طرح۔

اور مومو، جو اپنی تمام تر بزدلی کے باوجود مجھ سے زیادہ بہادر تھی، زندگی میں پہلی دفعہ مجھ سے ناراض ہو کر بہت دور جا چکی تھی۔



مومو مجھے تو اپنے ساتھ زندگی کی رنگینیاں، روشنیاں اور نغمات بھی لے گئی میری ذات، میرا وجود؟ میری زندگی، سب کچھ بہت بے کیف اور بے رونق سا ہو کر رہ گیا تھا۔

روز شام چھ بجے میں اپنی گاڑی عادتاً ”مومو کے گیٹ کے سامنے لے جا کر بارن بجاتا، پھر اچانک مجھے یاد آتا کہ اب اندر سے کوئی چھوٹی سی لڑکی نکلی کر یہ نہیں کہے گی کہ ”سرا! آج میرا میٹ ہے یا جلدی آئیں سر! میں نے آپ کے لیے چکن شالک بنایا ہے دیر کریں گے تو وہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور پھر آپ نہیں کھائیں گے“ کیونکہ وہ لڑکی تو جا چکی تھی۔

میں بو جھل دل لیے واپس آ جاتا، شام پھر اس کے گھر چلا جاتا۔ پھر یہ بھول ہر شام ہونے لگی۔ ساڑھے پندرہ برس کی عادتیں انہی آسانی سے تو نہیں جاتیں۔

جیسے ہر شام بندہ اپنے گھر واپس لوٹتا ہے، اسی طرح ہر شام میں اس کے گھر جاتا تھا، کتنے ہی مہینے بیت گئے اور مجھے یقین آ گیا کہ وہ مڑی ہوئی پلکوں والی لڑکی وہاں سے جا چکی ہے۔ جب یہ یقین آ گیا تو میں وہ بھول جان بوجھ کر دہرائے لگا۔

دو برس تک یہ سلسلہ چلتا رہا، میں نے امیدیں لے کر اس کے گھر کے دروازے پر جانا چھوڑ دیا۔ میں نے گھر میں ہاتھ کرنا بھی چھوڑ دیا، کیونکہ وہ مجھے مومو کی یاد دلاتا تھا۔ میں نے رات کا کھانا کھانا بھی چھوڑ دیا کیونکہ وہ مجھے صرف مومو کے ہاتھ کا پسند تھا۔ میں نے اونٹ روٹ میں ان دنوں پلاسٹک رکھنے بھی چھوڑ دیے میں نے بہت کچھ چھوڑ دیا، بس اس بھوری آنکھوں والی نازک سی لڑکی سے محبت کرنا نہ چھوڑ سکا۔ یہ میرے اختیار میں نہ تھا۔

پھر میں نے اپنی بے رونق، پھٹکی زندگی میں رنگ بھرنا چاہا۔ وہ رنگ جو مومو کو پسند تھے، جن کو وہ اپنی خوب صورت انگلیوں سے کینوس پر بکھیرنا چاہتی تھی، ہاں وہی رنگ میں نے اپنی زندگی میں بھرنے چاہا۔

پینٹنگ میرا بچپن کا شوق تھا۔ جب میں اسکول میں تھا تو چلائی ایمریسی کے زیر النقاد ایک پینٹنگ کمپیشن میں میری بنائی گئی ایک تصویر کو پہلا انعام اور مجھے بطور اعزاز آٹھ سو ڈالر دیے گئے تھے۔ وہ ڈالر میری بچپن کے خوراک لے تھے، اور وہ پینٹنگ مجھے کبھی واپس نہیں ملی کیونکہ وہ میرے پرنسپل کی بیٹی کو بہت پسند آگئی تھی۔ سو پرنسپل صاحب نے وہ اسے گفٹ کر دی۔

کوئی انسان یونہی دنیا سے بے اعتبار، بدگمان اور شکی مزاج نہیں بن جاتا یہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں جو ہم پر بہت گہرا نفسیاتی اثر چھوٹی ہیں۔

میں اس واقعے سے اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اپنا برش توڑ دیا، اینرل اور کینوس جلا ڈالے اور رنگ پھینک دیے، یوں میں نے وقتی طور پر اپنے اندر کے آرٹسٹ کو مار ڈالا۔

مگر رنگوں اور نگاروں کا دہس مجھے واپس اپنی جانب بلاتا رہا تھا۔

اور پھر اس روز جب میں نے مومو کی مصوری دیکھی تو مجھے ایک انجانا سا سکون ملا تھا۔ اسی لیے تو میں اسے پینٹر بننے کے لیے کہتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے اندر کے آرٹسٹ کو باہر نکال ہی لائے گی، وہ کینیڈا جا کر آرٹ ہی پڑھے گی۔ مومو کی انگلیاں یہ بات کہتی تھیں اور میرا دل یہ بات کہتا تھا۔

مومو کے جانے کے تیسرے برس میں نے ایک آرٹ اکیڈمی شام چھ سے سات تک جوائن کر لی۔ جو وقت میں پہلے مومو کو دیتا تھا اب مومو کے رنگوں کو دے رہا تھا۔

کبھی کبھار، کینوس پر رنگ بکھیرتے ہوئے میں اپنے

برش کو انگلیوں کے درمیان تمام کر سوچتا تھا کہ شاید مومو بھی اسی کمپنی اور ساخت کا برش استعمال کرتی ہو شاید وہ بھی رنگ کرتے وقت گردن کو یونہی ترچھا کرتی ہو شاید اس کے ہاتھوں پر بھی میری طرح Pastal طرز رنگ جاتے ہوں مگر اس کے ہاتھ تو بے حد خوب صورت تھے اور میرے ہاتھ میری شکل و صورت کی طرح عام سے ہی تھے۔

دو سالوں تک مختلف اکیڈمیوں میں آرٹ پڑھنے اور سیکھنے کے بعد میں نے ملنی نیشنل فرم کی وہ جاب چھوڑ دی جس کی خواہش لاکھوں نوجوان کرتے تھے مگر مجھے کوئی خواہش نہیں تھی یا پھر اب رہی نہیں تھی۔ جاب چھوڑنے کے بعد میں نے اپنے بینک بیلنس اور کچھ سیونگز کو ملا کر ایک جگہ کمرہ حاصل کر کے اپنی آرٹ اکیڈمی کھول لی۔

میری پسندینگز اور میری اکیڈمی اب میرے اخراجات پورے کرنے کے لیے کافی تھیں میں خوش نہیں تھا مگر مطمئن اور پرسکون ضرور تھا۔

میری آرٹ اکیڈمی کے دوسرے بیچ میں ایک بارہ سالہ لڑکی بھی سیکھنے آئی تھی۔ اس کو دیکھ کر مجھے پتہ نہیں کیوں مومو یاد آ جاتی تھی۔ اس کا نام ماریہ تھا اس کے ہاتھ اور انگلیوں کی ساخت بالکل مومو جیسی تھی اور اس کی بھوری آنکھیں مڑی ہوئی پلکیں اور لمبی سی فرنیچر برید بالکل مومو کی طرح تھیں۔ چہرے کے نقوش رنگت قدر وہ ہر لحاظ سے مومو سے مختلف تھی مگر پھر بھی دونوں میں بہت مماثلت تھی۔

ماریہ باتیں بھی مومو کی طرح کرتی تھی۔ دوسروں کی ہمدردی میں پھل جانا کسی کے غم کو اپنا سمجھ لینا اور خود کو فورا قربانی کے لیے پیش کر دینا۔ وہ مومو سے بہت ملتی تھی۔

جب اس نے اسکیج بنانا سیکھا تو پہلا اسکیج ایک پوٹینسیکل لیڈر کا بنایا اس کا وہ اسکیج ہاتھ میں پکڑے مجھے مومو پر ہی طرح یاد آئی تھی۔

وہ بھی تو ایسی ہی تھی۔ لیڈر ز اور سیاست دانوں کو پسند کرنے والی اور ایسی لڑکیوں کو میں بے وقوف کہا کرتا تھا۔ جانے کیوں وہ اسکیج دیکھتے ہی میرے لبوں سے مومو نکلا تھا۔

”جی سر! ماریہ جو میرے سامنے کھڑی تھی قدرے

حیرت بھری تابعداری سے بولی۔

میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر دھیرے سے مسکرایا ”کچھ نہیں“

”سر! آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میرا ایک نیم مومو ہے؟“

اس نے قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

مجھے حیرت کا جھجکا لگا مگر پھر میں سنبھل کر مسکرا دیا

تمہاری شکل پر لکھا ہے ماریہ!

”میری شکل پر؟“ وہ میری بات پر حیران ہوتی ہوئی اپنی

جگہ پر بیٹھ گئی۔

اس روز کلاس کے بعد جب میں اپنی چیزیں سمیٹ رہا

تھا ماریہ میرے پاس چلی آئی۔

”سرا ایک بات مانیں گے؟“

”ہاں بولو بیٹا!“ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

اس نے لمبے جینز کے اوپر آدھے بازوؤں والی ٹی شرٹ

پہن رکھی تھی۔ بال ہمیشہ کی طرح فرنیچر چوٹی میں مقید تھے یہ

حلیہ تو کسی اور کا بھی ہوتا تھا میں یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”سر! آپ میرا پورٹریٹ بنائیں گے؟“

”شیورنگیوں نہیں۔“ اس کے جھجکتے انداز پر میں

مسکرایا۔ ”کل اکیڈمی ٹائم کے بعد ایک ٹھنڈا ایکسٹرا بیٹھ

جانا۔“

”کتنی سننگز ہوں گی سر؟“ وہ مجھے بالکل مومو کی

طرح سرکتے ہوئے R کو silent کرتی تھی۔

”دو یا تین مگر میں گارنٹی نہیں دیتا کہ وہ بہت اچھی ہو

گی۔“

”ارے نہیں سر! آپ تو بہت اچھی پسندینگز بناتے

ہیں۔“ وہ ہنس کر بولی۔ اس طرح مجھے ارے نہیں سر کون

کہا کرتا تھا میں یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اگلی شام اس کو اسٹول پر اپنے سامنے بٹھا کر میں نے

جب اس کا پورٹریٹ بنانا شروع کیا تو آغاز آنکھوں سے کیا

اس کی آنکھیں بناتے بناتے میرے ذہن کے پردوں پر وہ

منظر لہر گیا جب مومو میرے سامنے ٹانگ پر ٹانگ رکھے

ناعمہ کے لاؤنج میں آرام سے بیٹھی تھی اور اٹھنے کے موڈ

میں نہ تھی۔

ایک سنگ میں پورا پورا پورٹریٹ مکمل کرنے کے بعد میں

یہ جانتے ہوئے بھی پرسکون تھا کہ میں نے ماریہ کا نہیں

مومو کا پورٹریٹ بنادیا تھا۔

”بن گئی سر؟“ ایک گھنٹے سے اسٹول پر ماڈل بن کر بیٹھی

ماریہ محل کر میرے پاس آئی۔ تصویر پر نگاہ پڑتے ہی اس

نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔

”کیسی نئی ہے؟“

”بہت اچھی ہے سر! مگر اس میں میں کہاں ہوں؟“

اس کے انداز پر میں بے اختیار ہنس پڑا۔

”تمہاری کل بنا دوں گا یہ کسی اور کی ہے۔“

”کس کی ہے؟“ اپنی مایوسی بھلائے وہ اشتیاق سے

پوچھنے لگی میں نے برش کے کنارے کولوں تلے دبائے کچھ

دیر کو سوچا ”مومو کی ہے۔“

”مومو کون؟“ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

”بے ایک لڑکی۔“ میں اداس سا ہو گیا۔ ”مجھے چھوڑ کر

چلی گئی ہے۔“

”کہہ دو؟“ وہ بھی اداسی سے پوچھنے لگی۔

”کینڈا۔“

”کیوں سر؟“ وہ میرے پاس رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

”میں نے اسے ناراض کر دیا تھا۔“ میں سر جھکائے

بنانے لگا۔

”تو آپ منالیں نا؟“

میں نے سر اٹھا کر مغموم انداز میں مسکراتے ہوئے

سے دیکھا ”مجھے اس کو ماننا نہیں آتا۔“

”کیوں سر؟“

”میں نے اسے کبھی منایا ہی نہیں۔“

”تو اب منالیں نا؟“

”کیسے؟“ میں نے امیزا اٹھائے۔

”کہہ دیں آئی ایم سوری سو سپل!“ اس نے آرام

سے کہہ دیا۔

”ہر بات آئی ایم سوری سے حل نہیں ہو جاتا ماریہ!“

”سرا مجھے پوری کلاس مومو کہتی ہے آپ ماریہ کیوں

کہتے ہیں؟“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنجیدگی

سے پوچھ رہی تھی۔

”میری صرف ایک ہی مومو تھی۔ بہت اچھی فرینڈ تھی

میری۔ تمہاری کوئی فرینڈ ہے ماریہ؟“ میں نے یونہی

پوچھا۔

اس نے افسردگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”میری کوئی

فرینڈ ہی نہیں ہے۔“

”ارے وہ کیوں؟“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے اٹھ کر چلی گئی۔

مومو بھی ایسے ہی اٹھ کر چلی جاتی تھی میں کبھی مومو کے

پیچھے نہیں گیا تو ماریہ کے پیچھے کیسے جاتا؟

اگلی شام مجھے ماریہ بہت چپ چاپ مل گئی تھی۔ چھٹی کے

وقت جب سب سنے جانے لگے تو میں نے اسے اپنے پاس

بلالیا۔

”ادھر آؤ۔“

وہ جو اپنا پنک کٹر کا بیگ لے کر باہر کھلنے والے

دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی میری بات پر سر جھکائے

میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”بیٹھو ادھر!“ وہ بیٹھ گئی تو میں نے پوچھا۔

”ماریہ! تمہاری مٹی کب فوت ہوئی تھیں؟“ اس کے

آنے سے پہلے میں نے فاطمہ سے جو ماریہ کے گھر کے

قریب رہتی تھی اس کے متعلق پوچھا تھا۔

وہ چند لمحے میری جانب خاموشی سے دیکھتی رہی پھر بولی

۔

”جب میں دو سال کی تھی تب!“

”اور تمہارے فادر؟ وہ تمہارا خیال کرتے ہیں؟“ مجھے

پتا نہیں کیوں حیدر یاد آتا تھا۔

”وہ مجھ سے زیادہ سارہ ماما میں انٹرنڈ ہیں۔ سارہ ماما

میری خالہ ہیں۔ وہ کئی سالوں سے میرے بھانے پاپا سے

ملنے ہمارے گھر آتی رہتی ہیں وہ پاپا سے شادی کرنا چاہتی

ہیں اور انہیں لگتا ہے کہ میں چھوٹی بچی ہوں اور کچھ نہیں

سمجھتی چھوٹی عمر میں بڑے بڑے غم مہر افساء اور ماریہ کو

بہت جلدی سنجیدہ اور پیچور کر دیتے ہیں۔

”اور پاپا ان سے شادی کر لیں گے؟“

”جی یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا۔“

”تمہیں اچھی نہیں لگتی سارہ ماما؟“ میں اس کے

چہرے کو بڑھ رہا تھا۔

”بالکل بھی نہیں۔ وہ مجھے گھر سے نکال دیں گی۔“

”ارے نہیں ماریہ! گھر سے کیوں نکال دیں گی؟“

تمہارے پاپا کا گھر ہے اور بھلا گھر سے کدھر نکالیں گی؟“

اس نے یقیناً ”سنڈریلا ٹائپ کی بہت ساری کہانیاں پڑھ

رکھی تھیں۔“

”آپ کو نہیں پتہ ہے ایک جگہ وہ بڑبڑاتی تھی۔“

گاڑی کے ہارن کی آواز آئی تو ماریہ اپنا بیگ سنبھال کر

اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر چند ہفتوں بعد ماریہ نے مجھے بتایا ”سر! بابا نے سارہ ماما سے شادی کر لی ہے۔“ وہ ان دنوں بست ڈری سہمی سی رہنے لگی تھی۔ میں نے اسے امید دلائی کہ حسب ٹھیک ہو جائے گا تب اس نے مجھ سے ایک فرمائش کی۔

”سر آپ میرے گھر آئیں۔“

اور میں نے ہائی بھری ”ہاں ماریہ“ میں آؤں گا تمہارے گھر اور تمہارے بابا سے بات کروں گا کہ وہ سارہ ماما سے زیادہ تمہیں امپورٹس دیا کریں۔“

وہ خوش ہو گئی۔

ہائی تو میں نے بھری مگر پھر ان دنوں کسی دوست کی شادی میں شرکت کے لیے مجھے کراچی جانا پڑ گیا۔

میں نے چار روز کے لیے اکیڈمی کی چھٹی کردی۔ چار بے حد مصروف دن گزارنے کے بعد جب میں اکیڈمی آیا تو میری پوری کلاس موجود تھی سوائے اس کھڑکی کے ساتھ والی کرسی کے وہ کرسی خالی تھی۔

یہ ماریہ کی پورے سال کی پہلی چھٹی تھی اس لیے میں نظر انداز کر گیا لیکن جب وہ اگلا پورا ہفتہ نہ آئی تو مجھے فکر ہوئی۔

”یہ ماریہ کیوں نہیں آ رہی؟“ میں نے قدرے بلند آواز میں کسی کو مخاطب کیے بغیر کلاس سے پوچھا تھا۔

”پتا نہیں سر!“

”پتا نہیں سر!“ کی صدا میں بلند ہوئیں۔

”سر آئی تھنک!“ اس کی اسٹیپنڈی نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔“ قاطمہ ماریہ کے گھر کے ساتھ رہتی تھی اسی لیے اس کے حالات سے اس حد تک واقف تھی۔

”گھر سے کدھر نکال دیا ہے؟ اسٹیپنڈی ہے کوئی جانو گئی تو نہیں جو گھر سے باہر نکلتے دے۔“ میں نے قدرے بے زاری سے کہا۔

”سر! ہو سکتا ہے سارہ آئی نے اسے ہسپتال بھیج دیا ہو۔“

قاطمہ دوبارہ بولی۔

”ہسپتال؟ کیوں؟“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”آپ کو نہیں پتہ سر؟“ بہت سے اسٹوڈنٹس اکٹھے ہوئے تھے۔

”کیا نہیں پتہ؟“ میں یکدم پریشان سا ہو گیا۔

”سر! ماریہ کو تھائی راز گینگنز کا کینسر ہے۔“

”واٹ؟“ میں بے حد شاکڈ سا ہو کر قاطمہ کو دیکھ رہا

تھا۔

ماریہ کتنی تھکی اسے کوئی دوست نہیں بتاتا اس کی وہ یہ تھی کہ وہ بیمار تھی۔ زندگی سے لڑ رہی تھی۔ کینسر کوئی چھوٹا کا سرخ نہیں تھا مگر یہ ہمارے معاشرے کا الیہ ہے کہ بیمار اور معذور انسانوں کو تنہا کر دیا جاتا ہے۔ وہ چھوٹا سی لڑکی جو مجھے مومو کی یاد دلاتی تھی وہ بھی اسی لیے کانٹا بھری تھی۔

”کب ہوا اسے کینسر؟“ میں فکر مندی سے پوچھنے لگا۔

”کبانی عرصے سے ہے۔ اب تو آخری اسٹیج ہے۔ چند ماہ پہلے ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ اس کے پاس چھ ماہ سے ایک برس تک کا وقت ہے۔“ قاطمہ کے لہجے میں ناست تھا۔

میں سر ہلا کر بے دھیانی سے اسٹوڈنٹس کی اسائنمنٹس دیکھنے لگا۔ دل میں مجھے بار بار ماریہ کا خیال رہا تھا۔

پتہ نہیں وہ کدھر ہوگی کس حال میں ہوگی۔ اگر اس کی سوتیلی ماں نے اسے گھر سے نکال کر ہسپتال بھیج دیا ہو تو وہاں اس ساتھ کوئی ہوگا یا وہ تنہا کمرے میں اپنی زندگی کے آخری دن کاٹ رہی ہوگی۔ پتہ نہیں اس کے پاس اس کے برش کھڑا اور کینوس بھی ہوں گے یا نہیں اور اس کا وہ پنک فکڑ کا بیگ جو وہ ہمیشہ اپنے پاس اٹھائے رکھتی تھی پتہ نہیں وہ بیگ اس کی سوتیلی ماں نے اسے ساتھ لے جانے دیا ہوگا یا نہیں۔

بہت سے سوال تھے جن کے جوابات میرے پاس نہیں تھے۔ میرا دل ارد گرد سے سخت اچاٹ ہو چکا تھا۔ میں نے بچوں کی جلدی چھٹی کردی اور خود اپنے داخلہ رجسٹر سے ماریہ کے والد کی ID کارڈ کی فوٹو کاپی سے اس کا ایڈریس لے کر اس کے گھر چلا گیا۔

اس کی بے حد خوب صورت مگر سرد سوتیلی ماں نے انتہائی کھردرے اور روکھے انداز میں مجھے اتنا ہی بتایا۔

”کل صبح آپریشن ہے مومو کا۔ سی ایم ایچ میں ایڈمٹ ہے۔“

میں نے کمرہ نمبر پوچھ کر استفسار کیا ”اس کے پاس کوئی ہے یا وہ اکیلی ہے؟“

”حسن صاحب! ہم یہاں فارغ نہیں بیٹھے کہ مومو کی پابنتی سے لگ کر اس کا دل بھلا نہیں سو کام ہوتے ہیں فرصت کسے ہے یہاں؟ جب تا کم لٹا ہے تو چلے جاتے ہیں۔“ انداز میں لائق اور بے نیازی تھی۔ وہ واقعی

ایسٹ دلی سوتیلی ماں تھی۔

میں ماریہ سے ملنے اسلام آباد سے پنڈی سی ایم ایچ چلا گیا۔ سارہ نے جان بوجھ کر اسے پنڈی میں داخل کروایا تھا کہ اس کا باپ اس سے ملنے روز روز نہ جاسکے۔

میں نے تازہ سرخ گلابوں کے ایک بو کے خرید اور ہسپتال آگیا۔ ایسا ہی ایک بو کے میں نے مومو کو بھی دیا تھا اور حیدر کہتا تھا مومو نے دے۔ پھول کتابوں میں سکھا کر رکھے ہوئے تھے۔

مومو کو ذہن سے جھٹک کر میں ماریہ کے وارڈ کی طرف چلا گیا۔

دروازہ ہلکا سا بجا کر میں اندر داخل ہوا۔ وہ ایک درمیانے سائز کا وارڈ تھا درمیان میں پردوں سے پارٹیشن کیا ہوا تھا ایک طرف ماریہ کا بیڈ تھا دوسری جانب کا بیڈ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”مومو۔“

ماریہ بیڈ پر تکیوں کے سہارے نیک لگا کر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ جھمت کو دیکھ رہی تھی۔ آہٹ پر اس نے نگاہیں گھما کر میری جانب دیکھا۔ ایک دم اس کی بھوری آنکھوں میں حیرت نما خوشی بھری تھی۔

”سر آپ اوھر؟“ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی، میں نے اسے اشارے سے روکا۔

”یہ جو اس چھوٹی سی گزبانے بغیر بتائے اتنی ذہیر ساری جھپٹیاں کی ہیں نا اس کے لیے اب اس کے سر ڈانٹنے آئے ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہہ کر پھولوں کا گلدستہ اس کے ہاتھ میں دیا۔

”تھنک یو سر!“ اس نے انیس سو گنگھا۔ وہ بہت خوش اور فریش نظر آنے لگی تھی۔ درنہ جس مل میں داخل ہوا تھا وہ مجھے بہت پشیموہ لگی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد نلکے بڑے تھے چہرہ سوکھ چکا تھا ڈال اندر پہلے گئے تھے اور رنگت پر قان کے مریضوں کی طرح زرد ہو گئی۔

”مجھے ریڈ روز بہت اچھے لگتے ہیں سر! کیونکہ ان کا مسیج بہت اچھا ہوتا ہے۔ بے ناسر؟“ وہ سر اٹھا کر میری ہنسی دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے بوجھ رہی تھی۔

میرے ذہن کی روکیں دور بھٹک گئی۔ ایسی ہی بات مومو نے بھی کی تھی۔ میں نے سر جھٹکا۔

”کیسی ہو مومو؟“ میں اس کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”ٹھیک ہوں سر! کل میرا آپریشن ہے۔“ وہ اداس سی

ہو گئی۔

”اداس مت ہوا کرو مومو! تم مجھے بہت عزیز ہو۔“ میں نے اس کا چھوٹا سا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر آہستہ سے دبایا۔

”سر! سارہ ماما نے مجھے شروع سے بتا رکھا تھا کہ مجھے کینسر ہے۔ آپ کو پتہ ہے ڈاکٹرز بچوں کو یہ بات نہیں بتاتے۔“ وہ معصومیت بھرے انداز میں سارہ ماما کی شکایت لگا رہی تھی۔ ”پتہ ہے کیوں؟“

میں نے بھی اسی معصومیت سے نفی میں گردن ہلا دی۔

”کیونکہ جب بچوں کو پتہ چل جاتا ہے نا تو وہ خوف زدہ ہو کر بہت جلدی مرجاتے ہیں۔“

”ماریہ!“ میں ایک دم تڑپ اٹھا تھا۔ ہسپتال میں رہ کر وہ پتا نہیں کیا کیا سنتی رہتی تھی۔

”کل تمہارا آپریشن ہے جس کے بعد تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ پھر ہم خوب ذہیر ساری باتیں کریں گے۔“ کچھ دیر بعد اسے تسلی دے کر میں اٹھنے لگا تھا۔

اس نے ہاموسی سے مجھے دیکھا۔ ”آپ جا رہے ہیں سر؟“

”ہاں میں کل آؤں گا ماریہ۔“ مجھے ہسپتال سے وحشت ہو رہی تھی۔ میں جلد از جلد وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ جتنا وقت میں ماریہ کے ہمراہ گزارتا تھا مجھے مومو یاد آتی رہتی۔

”آپ نہ جائیں سر!“

”اوکے نہیں جاتا!“ پتہ نہیں کیوں میں دوبارہ بیٹھ گیا۔

”کل میرا آپریشن ہے۔ کیا میں زندہ رہوں گی سر؟“ وہ ڈری سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔

میں اس کے سر ہانے آکر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ اس کے شانوں کے گرد رکھے۔ ”بس بیٹا! ایک چھوٹا سا معمولی سا آپریشن ہے۔ میرے ایک بھانجے کے ایسے چھ آپریشن ہوئے تھے اور اب وہ بھلا چنگا ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ حالانکہ میری تو کوئی ہمن ہی نہیں تھی۔

اس کی بھوری آنکھوں میں امید کی کرن جاگی۔

”یہ بس چھوٹا سا آپریشن ہے اس کے بعد تمہیں اس ہسپتال اور ان کڑوی کڑوی دواؤں سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی۔ تم بالکل ٹھیک ہو کر گھر چلی جاؤ گی۔“ اس کے سر ہانے بیٹھ میں اسے تسلیاں دے رہا تھا۔

”کب ہے آپریشن؟“ پھر میں نے پوچھا۔

”مجھ بھی بچے۔“ اس کا خوف اب کم ہو رہا تھا۔
 ”بس اب تھوڑا سا ٹائم رہ گیا ہے۔“ میں نے رات کے ساڑھے نو بجاتی سوئی کو دیکھا۔
 ”سرا!“ تھوڑی دیر بعد اس نے مجھے پکارا ”میں پینٹ کرنا چاہتی ہوں۔“
 ”تھوڑی دیر میں آجیوں کا زور اور چین لا دیتا ہوں۔“ میں اٹھنے لگا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
 ”نہیں بس مجھے میرا بیک اٹھا دیں۔“ اس نے اپنے پنک بیک کی جانب اشارہ کیا جو میز پر پڑا تھا۔ صدمہ شکر اس کا وہ بیک اس کے پاس تھا۔
 میں نے بیک اٹھا کر اسے دے دیا۔
 اس نے آہستہ سی زپ کھولی پھر آہستہ آہستہ اندر سے برش و اٹریسٹنس باہر نکالنے لگی۔ ایک کانڈ کو کلپ بورڈ میں لگا کر اس نے چسل تمام لی۔
 ”مومو! کیا یہ بستر نہیں ہے کہ تم آرام کرو؟ کل تمہارا آپریشن ہے۔“
 میں نے کسی خدشے کے پیش نظر کہا تھا۔
 ”پلیز سرا!“ اس نے اتنی بچی نگاہوں سے میری طرف دیکھا تھا یہ زندگی اور موت کی جنگ لڑتی اس لڑکی کی بے بس آنکھیں تھیں۔ میرا دل بھر آیا۔
 ”اچھا بالو مگر کیا بناؤ گی؟“
 اس نے چسل کا سرالوں میں پکڑ کر ایک لمحے کو سوچا، پھر مسکرائی۔ ”مومو!“
 ”اپنی شکل بناؤ گی؟“
 ”ارٹ نہیں سرا!“ وہ دھیرے سے ہنسی۔ اس کی سوکھی زرد چہرے کی ہڈیاں ہستے ہوئے نمایاں ہو جاتی تھیں۔
 ”میں نہیں آپ کی مومو۔“
 ”میری مومو؟“ مجھے حیرت ہوئی تھی۔
 ”آپ نے اپنی مومو کا جو پورٹریٹ بنایا تھا، وہ میرے پاس ہے۔ میں روز اسے دیکھتی ہوں مجھے وہ پس ہو گا۔“
 ”تھمرس میں آپ کو بنا کر دکھاتی ہوں۔“
 اور پھر وہ بہ وقت تمام تصویر بنانے لگی۔
 میری مہر النساء پھیلی تھوڑی تلے رکھے ناتحانہ لگا ہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایسے مجھے تب دیکھا تھا جب ناعمہ نے میرے سامنے بد زبانی کی تھی۔
 ”آپ کی مومو بہت اچھی ہے سرا! آپ اپنی مومو کو منالیں پلیز!“ تصویر بناتے بناتے وہ بولی تھی میں جواب میں

کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ کافی دیر بعد ماریہ نے تصویر مکمل کی۔
 ”کیسی ہے سرا؟“ اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔
 ”بہت اچھی۔“ میں نے سفید کانڈ کو ہاتھ میں لیے اس پر ہٹا کیچ دیکھا۔ وہ نوے فیصد مومو سے مشابہت رکھتا تھا۔
 ”اب کلر زکرو گی اس میں؟“
 ”نہیں میں تمہک گئی ہوں۔“ اس نے تھکاوٹ سے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔
 میں آہستہ آہستہ اس کا سر تھکنے لگا۔ جب وہ غیند کی آغوش میں جانے لگی تو اس کے لبوں سے نکلا تھا ”میں زندہ رہوں گی یا سرا؟“
 ”میری مومو کو کچھ نہیں ہو گا۔“ میں نے کہہ دیا مگر میرے اندر بہت خوف تھا۔
 ساری رات میں اس کے پاس بند کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔ وہ چھوٹی سی بچی میرے کندھے پر سر رکھ کر سو رہی تھی۔ رات آہستہ آہستہ سرکنے لگی۔
 وہ غیند میں تھی جب ڈاکٹر اسے لینے آ گئے۔ میں اب ایک انٹینڈنٹ بن گیا تھا۔ انہوں نے اسے غیند میں ہی استعفیا دیا تھا۔ انکے مہری خواہش تھی کہ وہ اسے جگہ دیتے اور میں چند ایک باتیں تو ماریہ سے لے لیتا۔ میں نے مومو کا کیچ جو مومو نے بنایا تھا اپنی جیب میں ڈال لیا۔
 مسلسل تین گھنٹے ماریہ کا آپریشن ہو تا رہا تین گھنٹے میں ہسپتال کے سرد، ویران کوریڈور میں بے چینی سے نہتا رہا۔ میرے قریب سے آری یونیفارم میں ملبوس نرسیں اور ڈاکٹر گزرتے رہے، کوئی میری پریشان صورت دیکھ کر تسلی کے دو لفظ بول دیتا تو کوئی ترحم بھری نگاہ ڈال کر چلا جاتا۔
 بالآخر میں تھک کر ماربل سے بنے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھ گیا۔ سردی کا کوئی احساس مجھے نہیں ہو رہا تھا۔ میرا رواں رواں ماریہ کے لیے دعا گو تھا۔
 تین گھنٹے کا وہ طویل انتظار، بمشکل کٹ ہی گیا اور آپریشن ٹیم کا دروازہ کھلا۔ کمرل ڈاکٹر عابد بیک باہر نکلے۔
 ”آپ بچی کے والد ہیں؟“ انہوں نے چہرے پر سے ماسک اور ہاتھوں پر سے گلوزا اتارتے ہوئے مخاطب کیا۔
 ”نہیں، ہم میں اس کا انکل ہوں۔ کیسی ہے وہ؟“ میں نے دفتر کے دل کے ساتھ پوچھا۔
 ”دیکھئے اس کا تھائی راڈ گینڈر مومو کرنا تھا، تھائی راڈ

گینڈر کے پیچھے ایک nerve ہوتی ہے اور۔۔۔“
 ”مجھے بتائیں ماریہ کیسی ہے؟“ میں نے بے چینی سے ان کی بات کاٹی۔
 انہوں نے گہری سانس بھری۔ ”وہ جو خاص رگ ہوتی ہے نا، وہ ان کی آپریشن کے دوران کٹ گئی ہے۔ آئی ایم سوری ماریہ کی ڈیوٹی ہو گئی ہے۔ دراصل اس رگ کو کٹنے سے بچنا بہت مشکل تھا۔“
 وہ گھبراہٹ سے کہہ رہے تھے؟ میں سن نہیں پا رہا تھا، مجھے سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ بہت کچھ میرے ذہن میں گونڈ ہو رہا تھا۔
 میری کلاس روم میں کھڑکی کے ساتھ رکھی وہ کرسی خالی تھی، وہ کرسی ماریہ کا انتظار کر رہی تھی اور ڈاکٹر کہہ رہا تھا ماریہ مر گئی؟ ماریہ کی ڈیوٹی ہو گئی؟ بالکل ایسے ہی ڈاکٹر ناشی کی ہونے لگا تھا، حیدر کی ڈیوٹی ہو گئی، حیدر مر گیا! اس ایک لفظ کا نا تھا زندگی اور موت کے درمیان؟ وہ مر گئی؟ وہ مر گیا؟
 کیوں قدرت اتنی ظالم ہوتی ہے؟ ماریہ کو کیوں مار ڈالا؟ کیا مانگا تھا اس لڑکی نے زندگی سے سوائے اپنے رنگوں، خوشبوؤں اور تکیوں کے؟ وہ کیوں مر گئی؟
 میرے سامنے اسٹریچر پر اس کی میت سفید چادر سے ڈھکی پڑی تھی، میں نے کرزنی انگلیوں سے چادر کا سرا اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ سفید، ساکت، جڑو۔
 کتنی اسید دلائی تھی میں نے اسے، کتنے جھوٹ بولے تھے میں نے اس سے، کتنی بار کہا تھا ”تم بچ جاؤ گی مومو! تھمرس کچھ نہیں ہو گا اور وہ مجھ پر یقین کر کے کتنے سکون سے آپریشن ٹیم میں جا گئی تھی؟ کتنی برس ہوئے، ایک مومو مجھ سے ناراض ہو کر چلی گئی تھی۔ اور آج ایک دوسری مومو مجھ سے دور جا چکی تھی۔ کیوں مجھے سب چھوڑ کر جاتے ہیں؟
 میں ہمیشہ آخر میں تنہا کیوں رہ جاتا ہوں؟

والوں کو آگاہ کرتے تھے ”یہ مومو کی سیٹ ہے۔ وہ کینسر سے مر گئی تھی۔ یہ اس کی جگہ ہے، یہاں کسی نے نہیں بیٹھنا۔ سر کو دکھ ہو گا۔“ اور نئے طلبہ سمجھ کر سر ہلا دیتے۔
 ماریہ کی موت کے تین برس بعد جب میں نے کلاس کا فرنیچر بدلوا لیا تو وہ کرسی وہاں سے نہیں اٹھوائی۔ کھڑکی کے ساتھ وہ کسی سی پڑی رہی۔
 اس دوران میں ایم فل کر کے آرٹ کے شعبے ہی کو بی ایچ ڈی کے لیے منتخب کیا، جب بی ایچ ڈی مکمل ہوا تو میں نے یونیورسٹی میں بطور آرٹ ڈائریکٹر کے جوائن کر لیا۔
 میری اکیڈمی اب بھی جاری تھی، اور کھڑکی کے ساتھ والی کرسی اب بھی خالی تھی، مومو اور مومو کی کرسی میری اکیڈمی میں لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔
 * * *
 سیادک میں دو کپ کے برابر کافی پھینٹ کر میں نے آؤرنگی سے اسے دیکھا تھا۔ ان تمام پچھلے برسوں میں، میں روز صبح دو کپ کافی پھینٹتا تھا۔ اپنے کپ میں دودھ اور چینی ڈال کر پی لیتا۔ جبکہ دوسرے کپ میں پھینٹی ہوئی کافی رہنے دیتا۔ شاید کہ وہ پلٹ آئے۔ مگر ہر دن کے اختتام پر جب مومو کہیں نہ ہوتی تو میں بے حد مایوسی سے اس کی کافی سنک میں بہا دیتا تھا۔
 آج میں نے کافی اس کے کپ میں ڈالنے سے پہلے ہی بہا دی، اب کیوں اور کس کا انتظار کروں۔ گیارہ برس کسی کو بھولنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ وہ کیوں واپس آئے گی؟ کیا رکھا ہے اس کے لیے یہاں؟
 میں نے تہہ کر لیا تھا کہ آئندہ اس کی کافی نہیں بناؤں گا۔ وہ اب نہیں آئے گی۔ وہ کبھی نہیں آئے گی۔
 ”شاید دودھ والا ہو۔“ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل کر دیکھا چاہا، مگر ایک لمحے کو تو زمین نے میرے قدم جکڑ لیے۔
 میرے سامنے ”میرے گھر کے باہر“ میرے دروازے پر مومو کھڑی تھی۔ مومو۔۔۔ میری مومو۔۔۔ میری مہر النساء میں نے پللیں زور سے جھپک کر اسے دیکھا۔ وہ کوئی انوژن نہیں تھا۔ وہ میری مہر النساء ہی تھی۔
 بلکہ آسانی کیسے شلوار پہنے، کندھے پر ہم رنگ دپنہ ڈالے، وہ مومو ہی تھی۔
 اس کا چہرہ پہلے سے قدرے میچور لگ رہا تھا۔ بال اب

ویسے لے نہیں تھے، بلکہ کندھوں سے بھی قدرے اوپر تھے۔ اس نے بھورے بالوں میں blonde اسٹریکنگ گرائی ہوئی تھی اور ان کو کیچر میں ایسے باندھ رکھا تھا کہ چند لٹیں چہرے کے اطراف میں بکھری ہوئی تھیں۔ دروازہ کھلنے پر اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ”مومو!“ اس نے مجھے اتنی خوشی ہوئی تھی کہ مجھے اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا تھا۔ میری مومو میری مرثیہ واپس آگئی تھی۔

”السلام علیکم سرا“ وہ دھیرے سے مسکرائی۔

”وعلیکم السلام۔“ خوشی کے مارے مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

”تو... اندر آؤ۔“ میں نے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ آہستہ سے چلتی ہوئی اندر آگئی۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں کوئی تہ شدہ کپڑا اٹھا رکھا تھا، میں نے وہ بیان نہیں دیا۔

”آؤ بیٹھو۔“ میں نے لونگ روم میں رکھے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔ وہ طائرانہ انداز سے اطراف کا جائزہ لیتی ہوئی نہایت نزاکت سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں جلدی جلدی اس کے لیے کافی پھینٹنے لگا۔ اگر میں چند لمحے پہلے اس کے حصے کی کافی نہ گرا تا تو کم از کم اسے دکھا کر مرعوب و متاثر کر ہی سکتا تھا۔

وہ صوفے پر بیٹھی ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ اب میرا لونگ روم پہلے کی نسبت بے حد صاف ستھرا ہوا تھا۔ دفعتاً اس کی نگاہ سائڈ ٹیبل پر رکھی گولڈ لف کی ڈیسے پر پڑی۔ اس نے چونک کے مجھے دیکھا، یہ چھوڑی نہیں اٹھی تک؟

کافی پھینٹتے ہوئے میں مسکرایا۔

”بہت کچھ چھوڑ دیا ہے مومو! مگر اس کو نہیں چھوڑا۔“ اس نے سر ہلادیا مگر شاید وہ میرے لہجے پر غور کر رہی تھی۔ اس کے کپ میں دو وہ ڈال کر میں نے دونوں کپس ڈالے میں رکھے۔ ساتھ شوگر پاٹ رکھا اور سینٹر ٹیبل پر لاکر رکھے۔ اس نے خود ہی آگے بڑھ کر شوگر پاٹ اٹھا لیا اور ایک نیچے میرے کپ میں ڈال کر آدھا اپنے میں ڈالا۔

”تمہیں تمہیں یاد تھا مومو؟“ میرے من میں نئے نئے گونج اٹھے تھے۔

”میں کچھ بھولی ہی کب ہوں؟“ اپنے کپ میں چمچ

بلا تے ہوئے وہ چلوں کی باڑ تھکا کر بولی۔

میں نے کافی کا گھونٹ بھرا۔ وہ بنا کی میں نے تھی مگر اس میں چینی مومو نے کس کی تھی۔ ایک دم سے بہت ذائقہ آ گیا تھا اس میں۔

”کیسے ہیں آپ سر؟“ چند گھونٹ بھر کر اس نے ساوگی سے پوچھا۔

”ویسا ہی جیسا تم چھوڑ کر گئی تھیں۔“

اس نے گہری سانس بھری اور پھر آدھرا دھرو دیکھا۔

”آپ کی وائف کہاں ہیں؟ سو رہی ہیں؟ میں جلدی آ گئی ہا؟“

میں نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”میں نے شادی نہیں کی مومو!“

کافی کا کپ لبوں کی طرف لے جاتے ہوئے اس کے ہاتھ یکدم ساکت سے ہو گئے۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر بے حد شاکد سی ہو کر مجھے دیکھ رہی تھی ”جی؟“

”میں نے شادی نہیں کی“ میں نے سر جھٹک کر دہرایا۔

کتنی ہی دیر وہ ساکت بتلیاں لے کر مجھے دیکھتی رہی۔

”دفعتاً اس کے لبوں میں جنبش ہوئی۔ ”کیوں سر؟“

میں نے شانے اچکا دیے۔ ”کوئی ٹی نہیں۔“

اس نے سر جھٹکا۔ میں نے بات کا رخ بدل کر پوچھا۔

”کب سے آئی ہوئی ہو ادھر؟“

”سات۔۔۔ یا آٹھ“ نہیں شاید سات۔۔۔“ وہ ذہن میں حساب کر رہی تھی۔

”اچھا۔ یعنی ہفتہ ہو گیا ہے۔“

اس نے گہری سانس اندر کو کھینچ کر مجھے دیکھا، پھر نفی میں گردن ہلائی۔

”آٹھ دن نہیں“ آٹھ ماہ ہو گئے ہیں۔“

میں نے بے یقینی کے عالم میں کپ میز پر واپسی رکھا۔

”تم آٹھ ماہ سے ادھر ہی ہو؟“

”ادھر نہیں، لاہور میں تھی پڑھ رہی تھی۔ ایف ایس سی بھی پیس سے کی۔“

”اور“ اور کینیڈا میں پڑھائی نہیں کی؟“

اس کا چہرہ پل بھر کو تاریک سا ہوا تھا۔ ”نہیں سردارو کی ڈینٹ کے بعد کینیڈا سے واپس لاہور آگئی تھی کینیڈا سے تو دوسرا بعد ہی واپس آگئی تھی۔ وہاں پڑھائی نہیں کی تھی۔“

مجھے یاد آگیا تھا۔ ”مومو مجھے حیدر کا بہت۔۔۔“ میں پل بھر کر رکنا کیسے تعزیت کروں؟ وہ تو میرا دوست تھا۔۔۔ میں۔۔۔ میں کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے سر جھٹکا لیا۔

”اسے کیا ہوا تھا مومو؟“

”انجائنا کا امیک تھا۔ ہم اسپتال لے کر گئے مگر ایسولینس کا ایک سیڈنٹ ہو گیا۔ پیپا کی ڈینٹ ہو گئی، مجھے چو میں آئی تھیں۔“ وہ سر جھٹکا بے تار سی گئی۔

”اور تم لوگ کینیڈا چلے گئے؟ میرا انتظار بھی نہیں کیا میں نے شکوہ کیا تھا۔“

اس نے سر اٹھا کر حیران نظروں سے مجھے دیکھا۔

”انتظار؟ پیپا نے انتظار ہی تو کیا تھا آپ کا روز صبح شام چکر لگاتے تھے وہ آپ کے گھر کے۔ مگر آپ نہیں آئے۔ دو ماہ تک وہ آپ کے گھر کے چکر لگاتے رہے۔ دو ماہ میں ساٹھ دن ہوتے ہیں سرا اور پھر وادے نے بھی آپ کا انتظار کیا تھا۔ لیکن جب وہ آپ کی جانب سے بالکل مایوس ہو گئیں تو ہم سین خالہ کے ساتھ چلے گئے وہ قدرے توقف سے ٹھنڈی ہوئی کافی پر نگاہیں جما کر بولی۔

”آپ کب آئے تھے سر؟“

”تمہارے جانے کے اگلے روز۔“

”کیا کیا آپ نے ان ساڑھے دس گیارہ سالوں میں؟“ اس کے انداز میں برسوں کی مسافت کی تھکاوٹ تھی۔

”میں نے آرٹ اکیڈمی کھول لی، پھر لی ایچ ڈی کی اور اب اکیڈمی کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھا تا بھی ہوں۔“

”آرٹ اکیڈمی؟“ اس نے حیرت سے گل میز پر رکھا۔

”تمہیں رنگوں سے کھیلتا اچھا لگتا تھا نا، میں نے تمہارے لیے اکیڈمی کھول لی مومو!“ میں کرب سے مسکرایا۔

”تمہارے ہاتھ کتے تھے کہ تم پینٹر بنو گی۔“

”میرے ہاتھ تو یہ بھی کتے تھے کہ میں سرجن بنوں گی۔“

”تو۔۔۔؟“

اس نے گود میں رکھا سفید سا کپڑا میرے سامنے کیا۔ وہ ایک اور آئل تھا۔

”مومو!“ میرے لبوں سے صرف اتنا ہی نکلا تھا۔

”میں پینٹر نہیں بن سکی سرا میں سرجن ڈاکٹر بن گئی ہوں۔ ایک برس پہلے تعلیم سے فارغ ہوئی ہوں پہلے کچھ عرصہ گجرات میں جاب کی، پھر ادھر آگئی۔“

”تم۔۔۔“ میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اس نے ان رنگوں کو

بھلا دیا تھا جن سے میں نے پچھلے اتنے برس بے تحاشا محبت کی تھی۔

”میں پچھلے کئی برس اپنی فطرت کے خلاف بھاگتی رہی ہوں سرا اور اب۔۔۔“ وہ دھکی دھکی سے مسکرائی۔

”اب تھک گئی تھی“ اسی لیے واپس آگئی۔“

”تمہارے ہنر مند اور فیملی؟“ میں نے دستر کتے دل کے ساتھ پوچھا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر میری جانب دیکھتی رہی پھر نفی میں سر ہلادیا۔ ”میں نے شادی نہیں کی۔ وہ سر جھٹکا بولی۔ اس کی آواز میں عجیب سی لرزش تھی۔

”کیوں؟“ مجھے طمانیت بھی ہوئی تھی اور حیرت بھی اس نے پلکیں اٹھا کر شاکی نظروں سے مجھے دیکھا۔

”کوئی ملائیں۔“ پھر اپنا اور آل اٹھا کر وہ کھڑی ہو گئی۔

”چلتی ہوں سرا آپ کی اکیڈمی آؤں گی۔“

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے قدرے دکھ سے اس کے اور آں کو دیکھا۔ ”تمہیں تو پینٹر بننا تھا مومو!“

”زندگی میں سب کچھ غیر متوقع ہی ہوتا ہے سرا!“

وہ مغموم انداز میں کہہ کر دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ ”مومو!“

آدھا دروازہ کھول کر اس نے پلیٹ کر مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے سر جھٹکا۔ ”کچھ نہیں۔“

”کہہ ڈالیں سرا آپ ہمیشہ باتیں ان کی چھوڑ دیتے ہیں۔“ وہ بہت پرسکون انداز میں بولی تھی۔

”تم یقین نہیں کرو گی۔“

وہ کھل کر مسکرائی۔ ”کیا یہی کہنا چاہتے ہیں کہ آپ میرے گھر روز شام کو چھ بجے آیا کرتے تھے؟“ میں مبہوت سا ہو کر اسے دیکھے گیا۔ ”تمہیں کیسے پتہ مومو؟“

”بعض عادتیں فطرت بن جاتی ہیں سرا جب میں سین خالہ کے غیر مانوس گھر کی غیر مانوس لا بھری میں شام چھ بجے آپ کے انتظار میں کتابیں کھول لیا کرتی تھی تو آپ تو پھر بھی ان ہی مانوس رستوں پر سفر کرتے تھے۔ کب تک آتے رہے تھے میرے گھر؟“

”دو سال تک!“

اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ پھر خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔ میں وہیں ساکت سا کھڑا دروازے کو دیکھتا رہا۔

نہنک کر رک گیا۔ میری نگاہیں دروازے پر جمی تھیں۔ تمام اسٹوڈنٹس نے میری نظروں کے تعاقب میں دروازے کو دیکھا۔ وہاں ایک دلنشین مسکراہٹ لبوں پر سجائے مومو کھڑی تھی۔

”میں آ جاؤں سر؟“ اس نے شرارت چھپاتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

”اسٹوڈنٹس“ یہ آپ کی نئی کلاس فیلو ہیں، ڈاکٹر مہر اساء حیدر! میں نے اس نازک سی لڑکی کا تعارف کرایا اور ڈاکٹر صاحبہ یہ میرے بہت اچھے اسٹوڈنٹس ہیں، امید ہے کہ آپ ان کو تنگ نہیں کریں گی۔“ میرے لمبے کی شرارت پر وہ کھنکھلا کر ہنس دی۔

”بالکل نہیں کروں گی“ میں بیٹھ جاؤں سر؟“ اس نے بچوں کی طرح اجازت مانگی۔ میں نے مسکراہٹ چھپا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کرسیوں کی جانب بڑھ گئی۔ تمام کلاس بھری ہوئی تھی۔ کرسی صرف ایک ہی خالی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ رکھی لکڑی کی وہ کرسی جو درے فرنیچر سے پیچ نہیں کٹی تھی۔ مومو اس کرسی کی جانب بڑھ گئی۔ جس کے دو وہاں بیٹھنے لگی، ساتھ والی نشست پر بیٹھی اٹھارہ سالہ اسماء نے پریشان ہو کر اسے روکا۔

”آپ ادھر نہ بیٹھیں۔“ مومو بیٹھتے بیٹھتے رک گئی۔ ”مگر یہاں اور کوئی کرسی خالی ہی نہیں ہے۔ یہ کیا کسی کی جگہ ہے؟“ اسماء نے میری جانب دیکھا اور پھر آہستہ سے مومو کو مخاطب کیا: ”یہ سیٹ مومو کی ہے، سر اس پر کسی کو نہیں بیٹھنے دیتے۔“ اسماء کی مدھم سرگوشی مجھے سنائی دے رہی تھی۔

”مومو؟“ مومو نے بے حد چونک کر اسماء کو دیکھا۔ ”سر کی کوئی چھوٹی سی بچی فریڈ تھی اس کا تک نیم مومو تھا۔ ایک دم مومو کھل کر مسکرائی اور اپنا پرس اسی کرسی کے بازو سے لٹکا کر اس پر بیٹھ گئی۔

”تمہیں پتا ہے یہ میری سیٹ ہے؟“ اس نے اسماء کو کہہ کر میری جانب دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں خوشی بے یقینی اور تشکر تھا۔ چند اسٹوڈنٹس نے پریشان سا ہو کر مومو کو دیکھا۔

”اٹس اوکے۔۔۔ یہ مومو کی سیٹ ہے۔ بیٹھی رہو“ مومو! میں نے مسکرا کر کہا۔

مومو بہت خوش ہوئی تھی، وہ جو سمجھ رہی تھی کیا وہ مجھے جاننے کی ضرورت ہے؟

کلاس ختم ہونے کے بعد مومو میرے پاس آئی تمام اسٹوڈنٹس باہر جا رہے تھے میں اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا۔ ”سر! آپ مجھے ڈراپ کروں گے؟“ اس نے اپنا پرس کندھے پر ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔

”ہاں جیور!“ میں نے اپنا سامان سمیٹ کر چھوٹے سے بیگ میں ڈالا، پھر ایک خیال کے تحت پوچھا ”آئی“ کیسی ہو؟“

”نیکی ہے!“ ”مومو!“ میں نے برہمی سے اسے دیکھا۔ ”اگر تمہارے پاس گاڑی نہیں تھی تو مجھے کہہ دیتیں، میں تمہیں پک کر لیتا۔ نیکی میں دھکے کھانے کی کیا ضرورت تھی؟ اب خبردار جو آئندہ تم نے پبلک ٹرانسپورٹ یوز کی تو“

وہ مسکراتے ہوئے میرے ساتھ باہر آگئی۔ ”تو آپ کو میری پروا ہے سر؟“

میں نے ایک لمحے کو رک کر اسے خفگی سے دیکھا۔ ”کیا تمہیں واقعی یقین نہانی کی ضرورت ہے؟“ ”نہیں سر!“ وہ فوراً ”بولی۔“ ”you care“ ”I Know“ میں نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ کالا ک کھولتے ہوئے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”تم میری زندگی میں سب سے اہم شخص ہو مومو! بلکہ میری زندگی میں صرف تم ہی تو ہو، وہ مسکراتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔



روز یونیورسٹی جاتے ہوئے میں مومو کو اسپتال چھوڑ دیتا اور واپسی پر پک بھی کر لیتا۔ اس کا شیڈول روز بدلتا رہتا تھا، مگر میں ہمیشہ اس کے لیے حاضر رہتا تھا۔

اس روز جب اس کی ازتالیں گھٹنے کی ڈیوٹی کے اختتام پر میں لے گیا تو وہ بہت تھکی تھکی لگ رہی تھی۔ ”اتنی لمبی ڈیوٹی؟“ میں نے فرنٹ سیٹ پر تھکی باری بیٹھی مومو پر ایک نگاہ ڈالی۔

”میری تو کل ہی ختم ہو گئی تھی۔ مگر ڈاکٹر انشاں کو کہیں جانا تھا اس لیے میں اس کی جگہ ڈیوٹی کر رہی تھی۔“

”ایک تو تمہاری سروس بھی نا!“ مجھے اس پر بے حد غصہ آیا تھا ”خواجواہ د سروں کے پیچھے خود کو ہلکان نہ کیا کرو۔“

”تو کیا ہوتا ہے سر؟ ہم دو سروں کے کام آجائیں اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے؟“ وہ سہولت سے بولی۔

”افسانوی باتیں مت کرو مومو! خبردار جو آئندہ تم نے کسی اور کی جگہ ڈیوٹی کی۔“ میں نے گاڑی آہستہ کر لی۔

بینک قریب ہی تھا، مجھے بینک سے ایک ڈرافٹ نکلوانا تھا۔ ”تم گاڑی پارک کرو ذرا“ میں اپنا کام کر لوں بینک بند ہی نہ ہو جائے گا۔ گاڑی کی چابی اسے تھما کر میں تیزی سے نکلا اور تقریباً ”بھاگتا ہوا بینک میں داخل ہوا۔“

پانچ منٹ بعد ہی جب میں اپنا کام ختم کر کے باہر آیا تو پارکنگ ایریا میں عجب سماں تھا۔

”میرا دس ہزار کا نقصان کر دیا ہے آپ نے۔ اب مجھے بتائیں میرا نقصان کون پورا کرے گا؟ آپ کو گاڑی نہیں ڈرائیو کرنی آتی تو کتنی گولیاں ہیں؟ بہتر ہے کہ آپ کسی ڈرائیونگ انسٹی ٹیوٹ میں جا کر چند دن کچھ سیکھ ہی لیں۔“

میری سفید کرولا کے سامنے کھڑی مومو، چپ چاپ نچلائی بیٹھتے ہوئے ایک درمیانی عمر کے آدمی کی ڈانٹ سن رہی تھی، میں نے ناگواری سے اس آدمی کو دیکھا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ میں نے قدرے سخت لہجے میں اس آدمی کو مخاطب کیا۔ اس غصیلے آدمی نے مرکز مجھے دیکھا ”ان محترمہ نے اپنی گاڑی ریورس کرتے ہوئے میری گاڑی کی بیک لائٹس توڑ دی ہیں۔ خدا کی پناہ میں۔“

”محترم! ایک منٹ، مجھے ان سے پوچھ لینے دیں۔“ میں نے مومو کو دیکھا۔ ”ہاں بتاؤ کیا ہوا ہے؟“

”سر! ان کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ میری گاڑی نہیں تھی، وہ والی کرولا تھی۔“ اس نے اپنے دائیں جانب ہو کر میری کرولا کی مائل ساخت اور رنگ والی گاڑی کی جانب اشارہ کیا، جس میں سے ایک فیملی نکل رہی تھی۔

درمیانی عمر کے آدمی نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا ”پھر اس دو سری سفید کرولا کی جانب بڑھ گیا۔“

”سوری سر! معاف کیجئے گا، مجھے سے غلطی ہوئی تھی۔“ چند لمحوں بعد وہ غصیلے آدمی جھاگ کی طرح بیٹھ کر ہم سے معذرت کر رہا تھا۔

”نہیک ہے۔“ سرزمیری سے کہہ کر میں نے مومو کو

گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تمام راستہ میں لب بٹھنے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ مجھے اس وقت مومو پر اتنا غصہ چڑھ رہا تھا کہ بہتر تھا میں خاموش ہی رہتا۔

اس کے گھر کے سیاہ آہنی گیٹ کے باہر گاڑی روک کر میں نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا ”خدا حافظ!“

اس نے قدرے شرمندگی سے مجھے دیکھا۔ اس کا بایاں ہاتھ لاک پر تھا مگر اس نے لاک نہیں کھولا۔ ”سر!“

”خدا حافظ!“ میں بدستور اسٹیمرنگ ہیل کو دیکھ رہا تھا۔ ”ناراض ہیں سر؟“ اس کی آواز کھٹی کھٹی سی تھی۔

”ناراض؟“ میں نے ایک جھٹکے سے اس کی جانب چھو کیا۔ ”مجھے تم پر غصہ آ رہا ہے۔ مومو! ایک شخص بھرے بازار میں تمہاری انسلٹ کر رہا ہے اور تم گونگی بن کر سنتی رہتی ہو زبردست!“

”میں اس کے خاموش ہونے کا انتظار کر رہی تھی!“ ”خود سے کوئی خاموش نہیں ہوا کرتا مومو! غلط کہنے والے کو خاموش کرانا پڑتا ہے۔“

”یہ وہ بول رہا تھا، میں بچ میں کیسے بولتی؟“

”تم اب بڑی ہو گئی ہو ڈاکٹر مہر النساء! پریکٹیکل لائف میں اگر تم بچی ہونے کے باوجود دو سروں کی لعن طعن سنتی رہو گی تو اس سے تمہارے خلیل جبران کے اقوال سچ ثابت نہیں ہو جائیں گے، بلکہ لوگ تمہیں شرمندہ سمجھ کر اور اونچا بولیں گے۔ خود کو ڈیفینڈ کرنا سیکھو، مومو!“

”رائٹ سر!“ وہ نابعداری سے سر ہلا کر گاڑی سے اتر گئی، مگر مجھے علم تھا کہ میں جتنا سر ہیٹ لوں، وہ کبھی بھی اپنی اس سب سے بڑی کمزوری پر قبو نہیں پاسکتی۔



”ارے!“ صبح مومو کو جاگنگ ٹریک پر دیکھ کر میں جو بیچ پر بیٹھا سا فانس ہموار کر رہا تھا، خوشگوار حیرت سے بول اٹھا۔ ”ڈاکٹر مہر النساء اور جاگنگ؟“

”ڈاکٹر حسان اور ریسٹ؟“ اس نے میرے یوں بچا پر بیٹھنے پر تانک کر حملہ کیا تو میں بے اختیار ہنس دیا۔

”اب ڈاکٹر حسان بوڑھے ہو گئے ہیں مومو بی بی! اب ریسٹ کرنا پڑتا ہے۔“

وہ میرے ساتھ بچا پر بیٹھ گئی۔ اس بچ کے پیچھے لگے درخت کی ٹہنیاں قدرے جھک کر ہمارے سروں پر سایہ کر

رہی تھیں۔ باد صبا کے خوشگوار جھونکوں سے ٹہنیوں پر لگے پتے پھڑپھڑاتے جاتے تھے۔ مومو نے ہاتھ بڑھا کر ایک پتا توڑ لیا، پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین پر گرانے لگی میں نے ایک نظر اس کے سپید ہاتھوں اور ان کے درمیان پکڑے پتے پر ڈالی۔

”آپ کو یاد ہے سراسر! ہم روز اور ہر بیٹھا کرتے تھے۔“ وہ اپنے گود کھینچتے ہوئے دور کہیں کھوسی گئی تھی۔

”مجھے کچھ بھی نہیں بھولا مومو!“ میں نے قدرے تھک کر ٹیک لگائی۔

”آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟“ اس کے لیے میں الجھن تھی وہ سر جھکائے قدرے آگے ہو کر بیٹھی پتے کے ٹکڑے کر رہی تھی۔ اس کے کندھوں پر اس کے بھورے streaking شدہ بال لہرا رہے تھے۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا، کوئی لی نہیں۔“ میرے لیے میں آزدگی سٹ آئی۔

اس نے پتے کا آخری ٹکڑا بھی زمین پر پھینک دیا، میں نے اس کے سپید ہاتھوں کو دیکھا اور ایک دم میری نگاہیں ایک چیز پر ٹھہر گئیں میں ایک ٹک اس کی کلائی کو دیکھ گیا وقت جیسے رک سا گیا تھا۔

اس کی سرمریں کلائی میں وہ پنک گھڑی آج بھی موجود تھی۔ اس کا رنگ پھیکا ہو چکا تھا اس کے ڈاکل نے وقت جتاننا چھوڑ رکھا تھا مگر مومو نے اب بھی اسے خود سے جدا نہ کیا تھا۔ اسی پنک رنگ کی گھڑی نے بالآخر مجھ سے وہ ٹھکرا دیا جو میں خود سے کہنے سے بھی ڈرتا تھا۔ جو میں حیدر سے کہنے سے بھی ڈرتا تھا۔

”مجھے شادی کرو گی مومو؟“ اس خوب صورت پارک کے سنگی بنچ پر بیٹھے نگاہیں اس پنک رسٹ واچ پر جمائے مجھے دنیا والوں کا خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ مجھے اپنی اڑتالیس برس کی عمر کے باوجود ایک چھبیس ستائیس سالہ لڑکی کو پروپوز کرتے ہوئے کسی کا ڈر نہیں تھا۔

مومو نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں آنسو تھے۔

”کیا آپ کو واقعی مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہے سر؟“ اس کا لہجہ شاک تھا۔

اور بالآخر میں نے مرا تہاء کو باہی لیا تھا۔

میری اور مومو کی شادی 26 نومبر 1997ء کو بہت سادگی سے ہوئی تھی۔

تمام گید رنگ مومو کے گھر پر تھی۔ میری جانب سے میرے چند دوست تھے رشتے داروں سے تو میں کب سے کٹا ہوا تھا اور آئی کی وفات کے بعد مومو بھی کٹ گئی تھی سواس کی طرف سے بھی چند کو لیگ ڈاکٹر زہی تھے۔

البتہ بین کینڈا سے اسٹیشن آئی تھی۔ مومو کو تیار بھی اس نے ہی کیا تھا۔

جب میں نے حیدر کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بین کو جی سنوری مومو کا ہاتھ تمام کر اندر لاتے دیکھا تو ایک پل کو تو میں مبسوت سا ہو کر رہ گیا۔

لائٹ پنک اور سلور رنگ کی کاہدار شلوار قمیص میں ملبوس نازک چو لری پہنے اس نازک سی لڑکی کے حسن کو ذرا سے میک آپ نے دو آنشہ کر ڈالا تھا۔ باوجود اونچے جوڑے کے اس کے ماتھے پر گولڈن براؤن اسٹریک شدہ کٹے ہوئے بال نکل ہی آئے تھے۔ پہلی دفعہ میں نے مومو کو قدرے سٹھی سٹھی اور نگاہیں جھکائے دیکھا تھا۔

بلیو ساڑھی میں ملبوس بین نے مومو کو سارا دے کر صوفے پر بٹھا دیا۔ یہ وہی صوفہ تھا جہاں پہلے کر برسوں پہلے مومو بہت روئی تھی۔

”بیٹہ جاؤ، حسان!“ سالیوں کے سے شرارتی انداز میں بین نے مجھ سے کہا وہ میری سالی تھی کم از کم وہ خود بھی کہہ رہی تھی حالانکہ وہ مومو کی خالہ تھی۔

میں مومو کے پیاد میں بیٹھ گیا اس کے دونوں ہاتھ گود میں دھرے تھے۔ ان میں سے ہندی کی تازہ مازہ، بھینسی بھینسی سی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

جو آچھپائی، دودھ پلائی، ڈھولک، ایسا کچھ نہ ہوا۔ اس عمر میں مجھے وہ سب بہت بچکانہ لگ رہا تھا۔ بس چند ایک تصاویر اتاری گئیں جو بین نے ہی اتاری تھیں۔

رکھتی کے وقت مومو بین کے گلے لگ کر خوب روئی تھی حالانکہ مجھے مومو سے یہ امید نہیں تھی مگر وہ بہر حال روئی تھی۔

”خالا! مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے مگر۔“ وہ بین کے گلے لگ کر آنسو بہاتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔

”غیروں جیسی باتیں کیوں کرتی ہو۔ مومو! تم تو میری بیٹی ہو۔“ مائیں تو بیٹیوں کے لیے بہت کچھ کرتی ہیں۔“

بین نے ساڑھی کے پلو سے آنکھیں خشک کیں۔ ”اچھا“ اب اپنے کزنز سے تاملو۔“

مومو مائی حلیمہ اور پھر اپنے تینوں کزنز سے خوب پیار سے ملی اور اپنے آنسو صاف کیے۔

میں نے ہولے سے مومو کا بازو تھاما۔ ”اب مومو میرے حوالے کرو بین! تم فکر مت کرو۔“

بین بھگی آنکھوں سے مسکرا دی۔

یوں میری زندگی کے اس بہترین دن خوشبوؤں میں ہی مومو میرے ساتھ رخصت ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے گھر آگئی۔

☆ ☆ ☆

”لیس یہ کاٹیں میں ذرا گوشت دھولوں۔“ پاز کی پلیٹ چھری سمیت اس نے میرے سامنے میز پر رکھی اور خود کچن میں چلی گئی۔

میں نے اخبار پر سے نظر ہٹا کر ایک لمبے کو پازوں کی پلیٹ کو دیکھا پھر گردن پھیر کر پیچھے بے کچن میں سنگ کے آگے گوشت کو دھوتی مومو کو۔

”تمہارا مطلب ہے کہ میں یعنی میں ڈاکٹر حسان رضا بی ایچ ڈی پاز کاٹوں؟“ مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

”جی ہاں میرا یہی مطلب ہے۔“ اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

وہ گھر کے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ بالوں کی پونی بنا رکھی تھی۔ مگر ماتھے والے بال پھر بھی چہرے پر آ رہے تھے۔ وہ پٹہ گلے میں تھا اور آستین کمنیوں تک ٹولڈ کیے ہوئے تھے۔

”آریو سیرس؟“ میں مصنوعی حیرانی سے چیخا تھا۔

”جی ڈاکٹر صاحب! مجھے ہیرانی بنانی ہے اس کا مسانا تیار کرنا ہے اور پاز آپ کاٹیں گے۔“ رانا تیزی سے گوشت کو دھو کر نوکری میں ڈالتے ہوئے نگاہیں اپنے کام کی جانب مرکوز کیے کہہ رہی تھی۔

”واہ! مجھے کیا پتا تھا کہ تم مجھ سے شادی کے دوسرے ہی ہفتے کام بھی کرانا شروع کر دو گی؟ وہ بھی پاز زانف!“ میں نے بڑبڑاتے ہوئے پاز زانھا لیے۔

”اتنی ساری پاز سے تم ہم دو لوگوں کے لیے کھانا بناؤ گی؟“ میں نے چھری سنبھال لی مگر اپنی پیاری بیوی کو طعنے دینا

نہ بھولا۔

”نہیں صرف ہمارے لیے نہیں۔ ساتھ میں مسز فاروق کے گھر بھی بھجوانے ہیں۔ اصل میں ان کا فون آیا تھا ان کی نوکرائی سیں ہے نا۔“

”تو انہوں نے تم سے یہ کہا کہ تم ان کو بریانی بنا کر بھیج دو؟“ لاجول دلا قوت۔“

میں نے سر جھٹکا۔

”ارے نہیں۔ وہ کیوں کہتیں۔ انہوں نے تو یونہی ذکر کیا تھا۔ میں نے کہا کھانے کی فکری نہ کریں میں بنا کر بھیج دوں گی۔ بے چاری اتنا شکریہ ادا کر رہی تھیں مجھے تو شرمندگی ہونے لگی تھی۔“

”استغفر اللہ مومو! وہ اپنا کام اٹھوانے والی بے چاری ہیں اور شرمندہ تم ہو رہی تھیں۔“ میں نے پازوں کا چھلکا امارتے ہوئے ٹوکا تھا۔

”اف او۔ ایسے تو نہ کہیں حسان!“ نماز کانتے ہوئے اس نے قدرے برا مان کر مجھے دیکھا۔ وہ اب مجھے حسان کہتی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ تو اب یہ باقی بریانی تم مسز فاروق کو بھیج دو گی؟“

پاز کانتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔ آواز بھی بھگی سی گئی تھی۔

”ساری نہیں۔ مسز ظاہر کو بھی تو بھیجوانی ہے۔“ میں نے تنک کر اسے دیکھا۔ ”یہ کون ہیں؟“

”وہی ظاہر صاحب کی بیگم۔ نئی نئی شادی ہوئی ہے جن کی وہ جو ابھی برسوں ہی یہاں شفٹ ہوئی ہیں۔“ مجھے یاد دلاتے ہوئے اس کی نگاہیں مجھ پر تھیں مگر ہاتھ اسی رفتار سے چل رہے تھے۔

”ہاں یاد ہے۔ تو ان پر کیوں کرم نوازاں کر رہی ہو؟“

”حسان ان کی نئی نئی شادی ہوئی ہے اور وہ ابھی تو شفٹ ہوئی ہیں۔ ان کو کھانے کی پر اہم ہوتی ہوگی نا!“ ساہو سے انداز میں کہہ کر اس نے کٹے ہوئے نماز ایک طرف رکھے اور اورک اٹھالی۔

”بس! مل گئی پوری کا کوئی کو مفت کی خادمہ جو کام کر کے خود ہی شرمندہ بھی ہوگی اور وہ احسان کر کے تمہارے ہاتھ کا بنا کھانا لے کر مزے اڑائیں گی۔ سبحان اللہ۔“ میں نے ستائشی انداز میں سر جھٹکا۔

”تم بھی نئی شفٹ ہوئی ہو اور تمہاری بھی ابھی شادی

وئی ہے۔ مگر بہت سادہ ہو تم۔" میں گہری سانس بھر کر
بازوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔
"اوہو حسان!" اس نے ادراک کاؤنٹر پر رکھی اور دوپٹے
سے ہاتھ پونچھتی میرے پاس آگئی۔ میں صوفے پر بیٹھا تھا
میرے سامنے میز پر بیٹھ گئی۔

"اگر ہم کسی کا خیال کریں گے تو کل کو وہ بھی ہمارا خیال
کریں گے اور آپ کو کہاں سے غلط فہمی ہو گئی کہ میں حال
ی میں شفت ہوتی ہوں؟" اس نے ہنس کر میری جانب
دیکھا۔ "میں تو ایک برس کی عمر سے اس گھر میں آجاری
ہوں۔ میرے لیے تو کچھ بھی نیا نہیں۔"
میں نے سر اٹھا کر اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔

"کیا یہ رشتہ بھی نہیں؟"
"ارے۔" وہ ہنس پڑی۔ پھر میرے ساتھ صوفے پر
بیٹھ گئی اور سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ "رشتہ تو نیا ہے۔
مگر ہم تو پرانے ہیں نا؟"

"اور میں تو بہت ہی پرانا ہوں۔" بڑھتی عمر کے احساس
کمتری نے مجھے اپنی لپٹ میں لے لیا تھا، میری آوازیں
خود بخود طنزور آتی تھیں۔

"اب تو میں بھی پرانی ہوتی جا رہی ہوں۔" وہ مصنوعی
اداسی سے بولی۔ "ستائیس سال کی ہو گئی ہوں۔ بڑی
مشکل سے شادی ہوئی، ورنہ اتنی اور اتنی لڑکی کو کون قبول
کرتا؟" اس نے ایک لمحے کو گلوں پر سے یوں فرضی آنسو
پونچھے کہ میں سمجھا وہ رو رہی ہے، مگر اگلے ہی پل وہ ہنس
پڑی۔

کھنے کو تو میں بھی ہنس دیا مگر دور کہیں میرے دل میں
عجیب سا خیال آیا تھا۔

"پتا ہے حسان!" اس نے لاڈ سے سر میرے کندھے پر
رکھ دیا۔ "میں جب کینڈا میں تھی تو اکثر سوچا کرتی تھی
پتہ نہیں آپ کا انتخاب کون سی لڑکی ہوگی؟ اور دل ہی دل
میں مجھے اس لڑکی سے جلیبی محسوس ہوتی تھی، اور جب
اس روز یارک میں آپ نے کہا، 'مومو تم مجھ سے شادی
کر لو گی' تو مجھے لگا میں جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ مجھے
نہیں پتا تھا کہ میں آپ کی زندگی میں اتنی اہمیت رکھتی ہوں۔"

وہ آنکھیں موندے بہت جذب کے عالم میں کہہ رہی
تھی، یکدم چونک کر سیدھی ہو گئی۔
"اوہ! آئل گرم ہو گیا ہو گا۔" وہ کچن کی طرف بھاگی۔

میں نے ایک نظر مومو پر ڈالی، وہ اب چولہا آہستہ کر
رہی تھی۔ مجھے چند لمحے پہلے والی اس کی مصنوعی آنسوؤں
والی حرکت یاد آگئی۔
اس روز مجھے علم ہوا تھا کہ مومو بہت اچھی ایکٹریس
ہے۔

"حسان!" میں بیڈروم میں بیڈر پر بیٹھا، تکیوں کے ساتھ
ٹیک لگائے، ایک تھرلر پڑھ رہا تھا جب مومو مجھے آوازیں
دیتی اندر آگئی۔

میں نے کتاب پر سے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا، پھر مسکرا
دیا، "جی، شہزادی مہر النساء!"

"اونسو۔" ایک تو اتنا بیک وروٹ نام رکھا ہے آپ نے
میرا، اور پھر اس میں شہزادی کا اضافہ بھی کر دیتے ہیں۔"
وہ بیڈ کے قریب کھڑی ہو کر خشکی سے بولی۔

"اجھا! اجھا! ڈاکٹر صاحب! فرمائیے۔" اس کی کولیگز
اور اسپتال کا اسٹاف اسے مہرکتا تھا۔

"ہاں، مجھے ذرا بتائیں، یہ آپ نے بتایا ہے؟" اس نے
ایک سفید کانڈ میری جانب بیٹھایا۔

"کیا ہے؟" میں نے کتاب ایک سائیڈ پر رکھی اور کانڈ
ہاتھ میں لے کر کھولا۔ عینک کو درست کر کے ایک نظری
کانڈ پر ڈالی تو میرے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔

وہ بارہ سالہ مومو کا اسکیج تھا جو بارہ سالہ ماریہ نے بتایا
تھا۔

"یہ آپ نے کب بنایا، حسان؟ اور مجھے کیوں نہیں
دکھایا؟ گتاپیارا ہے نا! مگر آپ نے گھڑکیوں نہیں کیے اس
میں؟ اور یہ صرف ہونٹوں پر ریڈرنگ کیوں کیا ہے؟" وہ

اپنی دھن میں گمن بولے جا رہی تھی۔ جو وہ سمجھ رہی تھی،
کہا مجھے بتانے کی ضرورت ہے؟ میں نے ایک اداسی بھری
سانس لے کر سر بیڈ کراؤن سے نکال دیا، پھر کانڈ کو چہرے کے
سامنے کر کے دوبارہ دیکھا۔

"ویسے آپ نے کب بنایا یہ؟" وہ میرے سامنے بیڈ پر
بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے کھلے بالوں کو سمیٹنے لگی۔

"یہ میں نے نہیں بنایا۔" میں نے کانڈ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر
رکھ دیا۔

بل سمیٹتے اس کے ہاتھ ایک لمحے کو رک گئے۔
"پھر؟" قدرے الجھن سے اس نے مجھے دیکھا۔

"یہ مومو نے بنایا تھا۔"
"مگر یہ میں نے نہیں بنایا۔" گلوں میں رکھے کیچر
اٹھا کر بالوں کو اس میں جکڑتے ہوئے وہ اطمینان سے بولی۔
"تم نے نہیں۔ میری ایک اور مومو بھی تھی۔" میں
نے بغور مومو کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ سوا یہ
عمر سادہ نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔

"ایک لڑکی تھی ماریہ۔ میری اکیڈمی میں آیا کرتی
تھی۔ اس کا ٹیک نیم بھی مومو تھا۔ میری اس سے اچھی
خاصی دوستی ہو گئی تھی۔" میں نے پھر کن اکھیوں سے اس
کے چہرے کو دیکھا۔

وہ بہت دھیان سے میری بات سن رہی تھی۔ مانتے سے
ہاں پھر نکل کر چہرے پر آگئے تھے، مگر وہ میری جانب پوری
طرح متوجہ ہونے کے باعث محسوس نہیں کر پاتی تھی۔

"مومو۔! تمہیں برا نہیں لگا کہ میری ایک دوست بھی
تھی؟" اس کے شفاف اور کسی قسم کی رقابت سے بے نیاز
چہرے کو دیکھ کر میں نے تنک آکر پوچھا۔

"برا کیوں لگے گا؟" اس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

"یہی کہ میں تم سے محبت کا دعویٰ دار ہوں اور دوسری
جانب تمہاری غیر موجودگی میں، میں نے ایک لڑکی سے
دوستی کی تھی۔"

"ارے نہیں حسان! میں یہاں سے آپ کو کسی
دندے یا رشتے کا پابند کر کے تو نہیں کر کے گئی تھی۔ جس
طرح میں آپ کی جانب سے آزاد تھی۔ اس طرح آپ

بھی میری جانب سے آزاد تھے۔ خیر آپ اس لڑکی کا تیار ہے
تھے۔ مومو کا آیا یہ وہی لڑکی تھی جس کے لیے آپ نے
سیٹ خالی رکھی تھی؟" مومو نے فوراً بوجھ لیا تھا۔ وہ جتنی
سزاہ لگتی تھی؟ تھی نہیں۔

"ہاں یہ وہی تھی اور اس سے پہلے کب۔"
"تم واقعتاً کسی غلط فہمی کا شکار ہو جاؤ، میں تمہیں

بتاؤں کہ وہ ایک بارہ سال کی بچی تھی اور مجھے۔! دل کی
طرح عزیز تھی۔"

"میں غلط فہمی کا شکار کیوں ہوں گی؟ آپ کی طرح شکی
ذہنیت نہیں ہے میری۔" وہ ہنس کر بولی تھی۔ "بہت اعتبار
ہے آپ پر۔"

میں اسے ماریہ کے بارے میں بتانے لگا۔ کس طرح
اس کی سوتیلی ماں نے اسے گھر سے نکال کر ہسپتال میں
داخل کر دیا، اور کس طرح وہ ایک خطرناک آپریشن کی

وجہ سے فوت ہو گئی۔ جب میں نے مومو کو بتایا کہ آخری
رات میں اس کے ساتھ تھا، اور اس نے میرے سامنے
مومو کا اسکیج بنا کر یہ کہا تھا کہ "آپ اپنی مومو کو متالیں۔"
تو مومو بے اختیار رونے لگی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی، دوسروں
کے دکھ درد پر رونے والی، ہمدردی لڑکی۔

اس کی آنکھوں سے گرتے آنسو دیکھ کر میں نے
بے اختیار سوچا تھا، مومو نے یہ کیوں کہا کہ اسے مجھ پر اعتبار
ہے؟

تو کیا مجھے مومو پر اعتبار نہیں ہے؟

مومو نے بچپن میں کبھی میرا اسکیج نہیں بنایا تھا، یہ رو بہ
اس نے شادی کے بعد بھی برقرار رکھا تھا۔ فرق صرف اتنا
پڑا تھا کہ پہلے وہ مجھے اس خاص "سلوک" کی وجہ نہیں بتاتی
تھی، البتہ اب اس نے جھپٹتے ہوئے بتا دیا تھا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے کہ میں غلط سلطہ بنا دوں۔" ہاں،
مومو کو ڈر بہت لگا کر تھا۔

کبھی اس سے کسی سالن میں نمک مرچ تیز یا کم ہو جانا،
یا پھر چاول چپک جاتے تو وہ سارا کھانا اٹھا کر فریج میں
چھپا دیتی اور میرے آنے سے قبل ہی ہوٹل سے کچھ
منگوا لیتی یا کوئی اور چیز پکالیا کرتی تھی۔ اگر میں فریج سے
خراب ہوا پکوان ڈھونڈ لوں تو ٹھیک ورنہ خود سے وہ مجھے
کبھی نہیں بتاتی تھی۔

ایک دفعہ سات مسٹنگز میں مومو نے بڑوسن مسز ظاہر
کا پورٹریٹ بنایا، مگر آخری دن اس نے یہ کہہ کر "کینوس پر
چینٹ کر گیا تھا، تصویر ضائع ہو گئی ہے۔" چند دن بعد مجھے وہ

بیسٹنگ اس کی الماری سے مل گئی۔ اس میں وہ چہرے کی
ساخت ٹھیک سے نہیں بنا سکی تھی۔ میں نے ہنس کر
چینٹنگ واپس رکھ دی۔ اگر وہ عادت سے مجبور ہو کر اپنی
غلطی کو چھپانا چاہتی ہے تو مجھے براہ غفلت نہیں کرنا چاہیے۔

مومو بہت سی باتیں دوسروں کی ناراضی کے خوف سے
انہیں نہیں بتایا کرتی تھی۔ وہ فطری طور پر بہت بزدل
تھی۔

مگر مومو محاس بہت تھی۔ جنہاں سے میری ضروریات
کا کہے بغیر علم ہو جاتا، وہاں وہ میرے احساسات تک بھی
رسائی حاصل کر لیتی تھی۔ وہ جانتی تھی میں اپنی بڑھتی ہوئی
عمر کے بارے میں احساس کمتری کا شکار ہوں، اس لیے اگر

کوئی فرد کسی پارٹی میں ہم دونوں کی عمروں کے تفاوت پر تبصرہ کر رہی لیکن تو وہ جو بہت ناگس تھی، نگلی لپٹی رکھے بغیر کھڑی کھڑی سنا دیتی تھی۔

مومو میرے ساتھ خوش تھی اور وہ خوش تھی تو میں بھی خوش تھا۔ عمروں کے فرق سے کیا ہوتا ہے؟ ہماری عمروں میں بائیس برس کا فرق تھا مگر ہماری شادی کے بعد گزرنے والا ہر برس پہلے سے زیادہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آتا تھا۔ ہم دونوں ایک مٹائی جوڑے تھے۔ پرسکون خوش اور مطمئن۔

تو یہ تھی میری کہانی۔ میری اور مہر النساء کی کہانی جو بعض لوگوں کو کسی بھی عام سی لوانسٹوری کی طرح لگے گی تو بعض کو محبت کی ایک طویل داستان۔ وہ کیا فقرہ ہوتا ہے فیری نیلز کے آخر میں؟ ہاں۔ یاد آیا۔

”اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔“

تو میں اپنی داستان کا اختتام بھی اسی فقرے سے کرتا ہوں۔ میں ”ڈاکٹر حسان رضا“ جس نے ڈاکٹر مہر النساء حیدر سے بے حد محبت کی، طویل مسافت کے بعد شادی کر لی اور یوں ہم دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے یہ تھا ایک اچھی کہانی کا اچھا خوشگوار انجام۔

کاش کہ میں یہ لکھ سکتا۔ کاش میں اپنی کہانی کو یہیں ختم کر سکتا۔ لیکن نہیں، ابھی میری اور مومو کی داستان اپنے اختتام کو نہیں پہنچی۔ ابھی تو بہت کچھ باقی ہے کیونکہ حقیقی زندگی میں ”ہنسی خوشی“ نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔

یہ مومو کی کہانی ہے اور یہ مہر النساء کی کہانی ہے اور عورت کی محبت کی داستانوں کے اختتام پر ہنسی خوشی نہیں ہوا کرتا۔ یہی بتانے کے لیے تو میں یہ داستان آپ کو سنارہا ہوں۔

اگر آپ کسی رومانٹک قسم کی افسانوی سی ”ہنسی خوشی“ کے متلاشی ہیں تو یہ داستان یہیں ختم کر ڈالیں۔ متھے پلٹ کر کوئی رومانوی سی کہانی کھول لیں جس میں نوجوان اور بے تحاشا خوبصورت لڑکا لڑکی معمولی رکاوٹوں کے بعد شادی کر کے ہنسی خوشی رہنے لگ جاتے ہیں۔

لیکن اگر آپ عورت کی اصل محبت اور عورت کی محبت کے اصل کو جاننا چاہتے ہیں اس کی حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو میرے ساتھ چند برس اور آگے چلنا ہوگا۔

میں نے جوں ہی سگریٹ کے پکٹ کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا مومو نے میرے سامنے میز پر ایٹش ٹرے رکھی۔

”کم پیا کریں حسان!“ تھوڑی دیر بعد جب میں عادی سگریٹ کے کش لگا رہا تھا، کچن میں کام کرتی مومو نے خفگی سے کہا تھا۔ ”آپ کو پتا ہے یہ آپ کو نقصان دے گی۔“

میں نے ایک نظر کچن میں ڈاکٹر کے پیچھے کھڑی مومو پر ڈالی۔ آدھے بازوؤں والی اسٹائنلش سی قمیص شلوار پہنے، دوشہ ایک کندھے پر ڈالے وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے مجھے گھور رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پر اس کی بھوری پونی ٹیل سے۔ ہاں نکل کر لہرا رہے تھے۔ شادی کے بعد سے لے کر اب تک اس نے بالوں کی لینتھ اور کٹنگ نہیں بدلی تھی۔

”روز نہیں پتا!“ میں نے سگریٹ کا آخری کش لگا کر اسے نہایت فرماں برداری سے ایٹش ٹرے میں پھینک دیا۔ ”اب کیا فائدہ؟ اب تو ختم بھی ہو چکی تھی۔“ میری چیٹنگ کو بھانپ کر وہ برا سامنہ بنائے رخ موڑ کر سبزی کائے لگی۔

ہماری شادی کے ان آٹھ برسوں میں مومو نے کبھی نوکرانی نہیں رکھی تھی۔ وہ ہر کام خود کرتی تھی۔ ڈسٹنگ سے گارڈنگ تک، کپڑوں کی دھلائی سے پیکنگ تک، مومو کو کبھی میبلر کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ یہ اس کا گھر تھا وہ ہنسی تھی ”مجھے اس کے درد دوار سے“ اس کے گھلوں اس کی مٹی تک سے پیار ہے۔ ”اور وہ اتنے ہی پیار سے اس گھر کے تمام کام کرتی تھی۔ اس نے پریکٹس چھوڑ دی تھی اس نے آرٹ اکیڈمی چھوڑ دی تھی وہ بس اپنے گھر سے محبت کرتی تھی اسے سبائی، سنواری رہتی تھی۔

میں چینل بدلتے ہوئے کن اکھوں سے اس کا جائز لے رہا تھا، مجھے بھوک لگ رہی تھی، صبح ناشتہ نہیں کیا تھا اور اب مومو دوسرے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔

”کھانے میں دیر ہے فی الحال یہی کھاؤ۔“ اسی وقت اس نے آلیٹ اور توس میرے سامنے رکھے۔

”تمہیں کیسے پتا چلا مجھے بھوک لگی ہے؟“ باوجود کوشش اور اتنے برسوں کی پریکٹس کے، میں ہر بار اپنی حیرت چھپا نہیں پاتا تھا۔ جواباً ”وہ مسکرائی۔ مسکرانے سے

اس کی آنکھوں کے گرد دھیمی دھیمی سی لکیریں بڑھ جاتی تھیں، ان لکیروں کے علاوہ کوئی علامت نہیں تھی جو اس کو جو تیس برس کا بتاتی تھی۔ وہ اب بھی بائیس تیس سالہ لڑکیوں کی طرح دلکش اور اسارت تھی۔

”بس مجھے پتا ہے، وہ کہہ کر کچن میں واپس چلی گئی۔

میں نے پلیٹ اپنی جانب کھسکا کی اور نیوڑ دیکھتے ہوئے پلیٹ کھانے لگا یکدم مجھے پیاس لگی۔

”یہ لیس۔ پانی۔“ مومو نے پانی کا لبالب بھرا ہوا گلاس میرے سامنے میز پر رکھا۔

”مومو تم۔“ میں گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ وہ کچن میں واپس چلی گئی۔

میں نے آلیٹ کھاتے ہوئے چینل بدلا۔ ایک چینل پر ڈرامہ آرہا تھا ڈرامہ تو پتا نہیں کون سا تھا مگر اس میں ایک باکرا (خالب) ہایوں سعید ایک روتے ہوئے چھوٹے سے بچے کو اٹھائے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

سبزی کائے مومو کے ہاتھ ایک دم رک گئے۔ بچے کے رونے کی آواز پر اس نے مڑ کر نیوی اسکرین کو دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ ایک دم سفید سا پڑ گیا تھا۔ وہ چھری پلیٹ میں چھوڑ کر کچن سے نکل کر لوگ روم میں لڑکی کے قریب آئی۔ اس کی نگاہیں اسکرین پر جمی گئیں۔ اس کے لب ہونے سے کپکپا رہے تھے۔

میں نے اس کے چہرے کو نگاہوں کے حصار میں لیتے ہوئے چینل بدل ڈالا۔

اس کی حرکت ٹوٹی تھی۔ اس نے چونک کر گردن پھیر کر مجھے دیکھا، پھر سر جھٹک کر تیزی سے کچن میں واپس چلی گئی۔

اس کا یہ ”رہ نم“ میں بیچلے کئی برس سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جو میں نے کہا تھا، ہر کہانی کے اختتام پر پیسی اینڈنگ نہیں ہوا کرتا تو ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

ہمارے ہاں اولاد نہیں تھی۔

اس بات کا مجھے نہیں مومو پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔

شادی کے بعد اکثر وہ ڈپریسڈ ہو جایا کرتی تھی۔ کبھی

کبھار ڈپریشن کے ہر دورے بہت شدید ہوا کرتے تھے۔ وہ

کڑواٹ کو نیند میں بولتی بھی تھی۔ میں سننے کی کوشش

کرتا، مگر اب میں بوڑھا ہو چکا تھا۔ میری حسرت کی

بارگروگی 50 فیصد تک گھٹ چکی تھی۔ باوجود کوشش کے میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ اس کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔

پھر ایک روز میں نے اس سے پوچھ لی۔ ”میں بائیس برسوں حسان!“ وہ ایک دم رونے لگی تھی۔ ”میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ میں آپ کو اولاد نہیں دے سکوں گی۔“

”مجھے نہیں چاہیے اولاد مومو! بس تم خوش رہا کرو۔“

وہ آنسو پونچھ کر سر ملا دیتی، مگر میں جانتا تھا، یہ غم اس کو اندر ہی اندر کھا رہا تھا، یوں لگتا تھا جیسے اس کے وجود کا کوئی حصہ بچ رہا ہے، گم ہو گیا تھا۔

خیالات کی رو میں بھٹکے، میں نے ایک دم چونک کر مومو کو دیکھا۔ وہ خاموشی سے نیچا لب بے دردی سے کپکتی ہوئی سبزی کاٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سر نہ نکلنے کو بے تاب تھیں۔

میں نے آسٹ سے اسے کبھی کر سکر چکا تھا۔

”کب لائٹ آف کرو گی؟“ ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھی مومو کو نگاہوں کے حصار میں لیتے ہوئے میں نے مسکرا کر پوچھا۔

وہ جو چہرے کی کلیننگ کر رہی تھی، میرے یوں دیکھنے پر جھینپ کر مسکرائی۔

”کدوٹی ہوں ڈاکٹر صاحب! ذرا کلیننگ تو کرلوں۔“ وہ نگاہوں کو نیچے جو کائے جھینپے جھینپے انداز میں بولی۔

میں نے مسکرا کر ساتھ رکھا فیشن میگزین اٹھایا اور یو ٹی وی پلٹ کر نہایت غیر دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

”مومو! یہ اس ایکٹرس کا کیا نام ہے؟“ میں نے ایک اداکارہ کی تصویر دیکھتے ہوئے جیسے یاد کرتے ہوئے مومو سے پوچھا۔ ایکٹرز کے نام یاد رکھنے میں میں ہمیشہ سے کمزور رہا تھا۔

مونسجرا اتر چہرے پر ملتے ہوئے وہ اٹھ کر میرے قریب آگئی اور قد دے جھک کر صفحے پر دیکھا۔

”ذہنی طور پر نیچے لکھا تو ہوا ہے۔“ وہ میرے ساتھ

پیٹ پر بیٹھ کر اب ذہنی طور صاحب پر لکھا گیا چنپنا کالم

پڑھنے لگی تھی۔ اس کے ہاتھ ابھی تک چہرے پر

مونسجرا اتر رہے تھے۔

”اچھا۔ میری عینک نہیں تھی اس لیے پڑھ نہیں

سکا۔ اب لائٹ آف کر دو نا!“

وہ میری بات سے بغیر میگزین پر جھکی قدرے حیرت سے کچھ پڑھ رہی تھی۔

”حسان! یہ لڑکا کون ہے؟“ اس کے چہرے پر متحرک ہاتھ اب رک چکے تھے۔ میں نے ڈیڑھ سو گز کے ساتھ تصویر میں کھڑے لڑکے پر بے توجہی سے نگاہ ڈالی اور کمپین پر بھا۔

”کوئی ایشن صاحب ہیں۔“

”ہیں؟“ اس نے میگزین میرے ہاتھ سے لے لیا۔

”یہ تو مجھے بالکل۔“

”تو کیا ہو گیا؟“ میں نے جمائی بمشکل روکی۔ مجھے نیند آ رہی تھی اور وہ محترمہ لاسٹ آف کرنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

”کون ہے بھئی؟ ڈیڑھ سو گز کا بیٹا ہے کیا؟“

”ارے نہیں حسان بیٹا کہاں۔۔۔ بوائے فرینڈ ہے اس کا۔ مگر یہ تو بالکل نیا ہے۔“

”اف تو بس یہ ڈیڑھ سو گز کو اس عمر میں کیا سوچیں؟“ اب وہ بڑے شوق سے آریکل پڑھ رہی تھی۔ میں بوسا ہو گیا۔

”اس عمر میں کیا مطلب؟ وہ تو اب بھی جوان لگتی ہے۔“

”جوان کہاں ہے؟ مجھ سے بھی بڑی ہوگی اور یہ ایشن تو اس سے آدھی عمر کا ہے۔“

”لو کرو گل۔ پہلے ڈیڑھ سو گز اتنے ایجنڈ بوس ولس سے شادی کی تھی تب یہ جوان تھی اور بوس ولس بڑی عمر کا۔ پھر اس سے طلاق لے لی اور اب بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں تو آدھی عمر کا بوائے فرینڈ! لاخوالا لاخوالا۔“

”بس ہوتی ہیں کچھ عورتیں۔ جنہیں۔۔۔“

”الیکٹرا سکیپس کا شکار“ کتے کتے رک گیا۔ یکدم میں بالکل سن سا ہو گیا تھا۔

”کئی سال پہلے میں نے مومو کو کہا تھا کہ وہ الیکٹرا سکیپس کا شکار ہے۔“

”مگر اب مجھے یقین سا ہو چکا تھا کہ وہ بالکل نارمل ہے اور اس نے مجھ سے شادی کسی نفسیاتی جس کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ میری محبت میں کی ہے۔“

”لیکن اس رات اچانک مجھے وہ بات یاد آگئی تھی۔ پتا نہیں کیوں میں ایک دم بے زار سا ہو گیا تھا۔“

”لاسٹ آف کردو۔“ میں بستر پر کروٹ دیوار کی طرف کر کے لیٹ گیا۔

”سو گئے؟“ میگزین سائیڈ پر رک کر مومو نے مجھے پکارا تھا۔

میں نے جواب نہیں دیا۔ میری طبیعت عجیب سی ہو رہی تھی۔

دن میں کتنی بار میں اپنی شکل دیکھتا تھا۔ کیا میں اس قابل تھا کہ مومو جیسی خوب صورت پڑھی لکھی اور خود انحصار لڑکی مجھ سے شادی کرتی؟

میں ایک عام سی شکل کا عام سا مرد تھا۔ میرے اندر ظاہری طور پر سوائے ایک گریس فل پر سٹائلی کے کوئی خوبی نہ تھی۔

میرا احساس کمتری نہیں بلکہ یہ کچھ اور تھا۔ جو مجھے یہ سب کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

ایک مبہم سا خیال جسے میں ان گزرے برسوں میں بھلا چکا تھا ایک دفعہ پھر میرے ذہن میں واپس آ چکا تھا۔

وہ خیال کیا تھا کیا مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے؟

* * *

”ڈاکٹر صاحب کل میرے ساتھ شاپنگ پر تو چلیں۔“

میرے ساتھ پارک میں واک کرتے ہوئے ایک دم مومو نے فرمائش کی۔ جب اسے مجھ سے کوئی کام ہوتا وہ مجھے ڈاکٹر صاحب کہتی تھی۔

”اچھا۔ سوچیں گے۔“ میں نے ٹال دیا۔ وہ قدرے مایوس سی ہو کر پتھری رویوش پر چلنے لگی۔

وہ آگے چل رہی تھی میں پیچھے تھا۔ اطراف میں شام کے نیلگوں سائے اپنے پر بھیلارے تھے۔ اسٹریٹ لمپس جل اٹھے تھے، آفس سے گھر واپس آنے والوں کی گاڑیاں اور موٹر سائیکلوں کا شور پارک کے پرسکون ماحول میں خلل ڈال رہا تھا۔ میں اور مومو روز اس ٹائم گھنٹہ بھر واک کرتے تھے۔ یہ وہ گھنٹہ ہوتا تھا جب ہم دونوں بالکل خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے تھے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کرتے، بس اپنی اپنی سوچوں کے بھنور میں پھنسے رہتے۔ کبھی میں آگے نکل جاتا تو کبھی مومو۔ وہ گھنٹہ بھر پرسکون ہوتا تھا۔ یاں اگر مومو کو کوئی فرمائش کرنا ہوتی تو وہ اسی گھنٹے میں کرتی تھی۔ جیسے اس روز اس نے کی تھی۔

میں اس سے دو قدم پیچھے چلتے ہوئے اس کی پشت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے شولڈر کٹ بال ہمیشہ کی طرح کبچر میں ہانپ بندھے تھے۔ وہ سر جھکائے کچھ سوچتے ہوئے چل رہی تھی جب دفعتاً ”ٹھنک کر رکی اور دائیں جانب دیکھا۔“

میں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں۔ ہمارے سے چند قدم کے فاصلے پر دائیں جانب ایک چھوٹا سا سات آٹھ برس کا بچہ اپنی ماں سے باتیں کرنا ہوا گزر رہا تھا۔ اس نے سر پر لی کیپ پہن رکھی تھی اور جتنے ہوئے ماں کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ مومو ٹھنک کر ان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں مخالف سمت سے آرہے تھے ہمارے قریب پہنچ کر ایک دفعہ پھر ہم سے دوڑ جانے لگے تو مومو چہرہ موڑ کر ان کو دیکھنے لگی۔ میں اس سے چند قدم پیچھے تھا اب مجھے اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنی نگاہیں اس سات آٹھ سال کے بچے کی پشت پر جمائے مومو کی بڑی لائبی آنکھوں میں اتنی بے بسی اتنی حسرت اور اتنا کرب تھا کہ میں نے بے اختیار آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔ ”چلو مومو! گھر چلو۔“ میں اسے اس بچے سے دور لے جانا چاہتا تھا۔

مومو نے سختی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ اب بھی اس بچے کو اپنی ماں سے دور جانا دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں شدت ضبط سے سرخ ہو رہی تھیں۔

”مومو!“ میں نے اسے دوبارہ پکارا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر ایک دم مڑی اور بھاگتی ہوئی پارک سے باہر نکلنے والے رستے کی جانب جانے لگی۔

میری عمر اب بھانگنے والی نہیں تھی سو میں تیز تیز چلا ہوا اس کے پیچھے گیا۔ مجھے پتا تھا وہ کھر جا رہی ہے۔ اس کے پاس رونے کے لیے وہی جگہ تھی۔

”مومو!“ میں نے دروازہ بجایا ”مومو! دروازہ کھولو۔ پلیز کھولو!“

مگر اس نے دروازہ نہ کھولا۔ شدید ڈپریشن میں وہ خود کو کمرے میں بند کر لیا کرتی تھی۔ آج بھی اس نے یونہی کیا تھا۔

”مومو! دروازہ کھولو۔“ میں نے ایک دفعہ پھر کرا کر اس نے دروازہ نہیں کھولا۔

میں نے دروازے میں نصب لاک کے کی ہول سے اندر جھانکا۔ وہ دروازے کے بالکل سامنے والی دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھی تھی۔ اس کا سر اس کے گھٹنوں پر تھا۔ اس کا کبچر کہیں گر گیا تھا اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ خود بھی ٹوٹی ہوئی بکھری بکھری لگ رہی تھی۔ اس کی دلی سسکیوں کی آواز اور ہولے ہولے لڑنا جو وہ بچہ تیار ہوتا تھا کہ وہ رو رہی تھی۔

شادی کے بعد یہ پہلی دفعہ تھا جب وہ بے اولادی کے غم میں یوں پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ اس طرح بچکیوں کے ساتھ تو وہ صرف ایک دفعہ اپنے گھر کے ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھ کر روئی تھی۔ کیا مجھے آپ کو یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ کیوں روئی تھی؟

”مومو!“ میں نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا مگر مومو نے دروازہ نہیں کھولا اس کے رونے میں شدت آگئی تھی۔ اب مجھے سسکیوں کی بجائے ادنیٰ آواز میں رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

وہ رو رہی تھی میری مومو رو رہی تھی وہ جسے میں نے صرف ایک دفعہ ایسے روتے دیکھا تھا وہ آج دوسری دفعہ دیے ہی رو رہی تھی۔ پہلی دفعہ جب وہ ایسے روئی تھی اس کے باپ نے چپ چاپ اس کی بات مان لی تھی۔ وہ کہتا تھا۔ ”عمروں کے بے تحاشا فرق والی شادیاں غیر فطری ہوتی ہیں اور جو چیزیں غیر فطری ہوتی ہیں وہ ایک دن ناکام ہو کر اپنی جگہ پر واپس آتی جاتی ہیں۔ ایسی شادیوں سے صرف دل ٹوٹتے ہیں۔“ وہی حیدر میرے لیے مومو کی بات مان گیا تھا۔

آج اس کا باپ زندہ نہیں تھا ورنہ اس کو چپ کرارتا۔ اس کو مٹا لیتا۔ میں تھا تو مگر مجھے اس کو مٹانا ہی نہیں آتا تھا۔ اس کے زخموں پر مرہم رکھنا بھی نہیں آتا تھا میں تو کبھی مومو کے پیچھے اسے پکارنے بھی نہیں گیا تھا پھر بھلا میں اب کیسے اسے مٹاتا؟

اس رات میں اسٹڈی روم میں سو گیا تھا۔ مومو پوری رات روئی رہی تھی۔

* * *

”جلدی آجائے گا حسان!“ میں اس صبح یونیورسٹی کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ مومو نے پیچھے سے آکر کہا۔

میں نے کٹھنھی کرتے ہوئے ڈرائنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے پیچھے کھڑی اپنی اسماٹ سی بیوی کا عکس دیکھا۔

”آجائیں گا جلدی۔ خیر تو ہے نا؟“ میں نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے رفیوم کی شیشی اٹھائی۔ اس نے شیشی میرے ہاتھ سے لے لی۔ میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

”وہ اصل میں آج صائم آ رہا ہے نا؟“ اس کی چھٹیاں ہیں خالہ نے اسے پاکستان بھیج دیا ہے۔ میں نے کہا۔

خواتین وہ لاہور میں دوسرے رشتے داروں کے پاس کیوں

رہے۔ اس لیے خالہ کو کہہ دیا کہ چھٹیوں میں وہ ادھر ہی رہے گا۔ آخر میں اور داد بھی خالہ کی طرف رہتے تھے۔ میں نے ٹھیک کہا تھا حسان؟ وہ اب پر فہم مجھ پر اس پر کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں بالکل ٹھیک کہا۔“ میں نے ہولے سے اس کا گل چھو کر اپنی کتابوں کی جانب بڑھ گیا۔

صارم کے بارے میں مجھے اتنا یاد تھا کہ وہ ہماری شادی پر موجود تھا۔ ایک چھوٹا سا پیارا سا دس بارہ سالہ بچہ، چلو اچھا تھا وہ آ رہا تھا۔ اس کے آنے سے گھر میں رونق ہو جائے گی اور مومو جو اپنے کزنز کو اتنا پس کرتی تھی وہ بھی خوش ہو جائے گی۔

یونیورسٹی میں کلاس کے دوران اور پھر بعد میں بھی صارم کا خیال میرے ذہن سے بالکل نکل چکا تھا۔ میرا دن خاصا مصروف گزرتا تھا۔ یونیورسٹی کے بعد مجھے بینک میں کسی کام سے جانا پڑ گیا وہاں سے نکلا تو ایک پرانا دوست راستے میں مل گیا۔ اسی چکر میں شام ہو گئی، مومو کی ناکید میرے ذہن سے بالکل نکل چکی تھی۔ سو آرام سے پانچ بجے کے قریب گھر پہنچا۔

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی میں نے ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے ہوئے کوٹ اتار کر صوفے پر رکھا۔ اپنی کتابیں سینئر ٹیبل پر رکھ کر میں اپنے کمرے کی جانب بڑھنے ہی لگا تھا کہ ایک چکن کاؤنٹر کے ساتھ کھڑے اس اجنبی کو دیکھ کر چونک سا گیا۔

جھپٹ سے نکلتا قد، چوڑے کندھے، انہیلنک جسم، وہ جو بھی تھا اچھا خاصا باڈی بلڈ رنگ رہا تھا۔ وہ میری جانب پشت کر کے کھڑا غالباً ”جوس پی رہا تھا۔“ بلیک پیٹ پر سفید ٹی شرٹ میں ملبوس اجنبی نوجوان کو اپنے گھر میں دیکھ کر میں بری طرح ٹھٹکا تھا۔

”ایکسکیوز می۔“ میری آواز پر وہ جوس پیتے پیتے کسی خیال سے چونکا اور پلٹ کر مجھے دیکھا۔ اس نے شاید میرے آنے کی آہٹ نہیں سنی تھی۔

پشت سے دیکھنے پر وہ مجھے پورا مرد لگا تھا مگر اس کی شکل پر ابھی لڑکپن تھا۔ لمبے قد، چوڑے کندھوں اور مسند کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے تھوڑا بڑا لگتا تھا۔

”السلام علیکم سر۔! میں صارم ہوں۔“ اس نے جوس کا گلاس کاؤنٹر پر رکھ کر قدرے لاپرواہ انداز میں تعارف کرایا۔ مجھے تو گویا جھٹکا لگا تھا۔ صارم تو میرے ذہن میں

صرف دس گیارہ سال کا بچہ تھا، مگر یہ تو بھرپور مرد لگتا تھا۔ ہماری شادی کے وقت وہ نو یا دس سال کا تھا تو اب سترہ اٹھارہ برس کا ہو گا۔ وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے، پتا ہی نہیں چلتا۔

”اوہ صارم۔! سوری میں پہچانا نہیں۔ مومو کے کزن ہو تم، رائٹ۔؟“ میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، مگر میرے انداز میں گرم جوشی مفقود تھی۔ صارم نے بھی قدرے سرد انداز میں سلام کا جواب دیا۔

”ارے حسان، آپ آگے؟“ اسی لمحے مومو بند روم کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ اسی لمحے مجھے یاد آیا اس نے مجھے جلدی آنے کو کہا تھا۔

”حسان، یہ صارم ہے۔ بڑا ہو گیا ہے نا؟“ وہ خوشی خوشی تعارف کر رہی تھی۔ ”اور صارم، یہ میرے ہرمنڈ حسان ہیں۔“ اس نے ایک دفعہ بھی میرے دیر سے آنے پر شکوہ نہ کیا۔

”مل چکا ہوں۔“ میں نے آواز میں گرم جوشی پیدا کرنے کی کوشش کی مگر مجھے وہاں تعلق نظر آنے والا مغرور سا لڑکا چہ نہیں کیوں پسند نہیں آتا تھا۔

”مومو۔! میں اندر کمرے میں ہوں۔ کھانا کھائے تو ڈالیں۔“ میں کوٹ اتار کر اندر چلا گیا۔

نہا کر میرا خیال تھا کہ میں فریش ہو جاؤں گا مگر یہ نہیں کیوں عجیب سی بے زاری میرے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔ میں یونہی بستر پر لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا۔ جب میں ٹینشن میں ہوں یا پریشان ہوں تو یونہی لیٹ جاتا تھا۔ مومو فوراً ”میرے پاس آکر فکر مندی سے وجہ پوچھتی تھی اور میں اسے بتا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا تھا۔ مگر اس شام مومو پوچھنے نہیں آئی۔ وہ اپنے کزن کی خاطر مدارات میں مصروف تھی۔ اگر وہ پوچھتی بھی تو میں کیا جاتا؟ مجھے تو خود نہیں پتا تھا کہ مجھے پریشانی کس بات کی ہے۔

رات کھانے پر وہ مجھے بلانے آئی تو میں خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ کچن میں رکھی ٹیبل کے گرد رکھی چار کرسیوں میں سے میری مخصوص سیٹ پر صارم بیٹھا تھا۔ مجھے کچھ کوفت سی ہوئی۔ میں ایک دوسری کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ مومو کھانا لگانے میں اتنی مگن تھی کہ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ صارم میری کرسی پر بیٹھا ہے یا شاید مومو میری جگہ کسی اور کو دینے پر رضامند ہو گئی تھی؟

میں نے ذہن میں آئے دوسروں کو جھٹک کر اپنی توجہ میز

پر رکھی ڈشیز پر مرکوز کر کے کی کوشش کی۔

میکرو نیوز، رشین سلاد، فرائیڈ فش اور چکن واپائن ایبل اس نے غالباً ”صارم کے لیے بنائے تھے۔ میرے لیے اس نے الگ سے اچار گوشت بنایا تھا، مجھے تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ میری بیوی کو گھر آئے مہمان کا کتنا خیال تھا، مگر پتا نہیں کیوں مجھے خوشی نہیں ہوئی تھی۔

”یہ لوٹا صارم!“ اس نے میکرو نیوز کی ڈش صارم کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ ”اور ذرا فرائیڈ فش ٹیسٹ کرو، تم فش شوق سے کھاتے ہو نا۔“

اس کو صارم کی پسند ناپسند کا بخوبی علم تھا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ مجھے اچھا لگتا تھا۔ وہ صارم کا بہت خیال رکھ رہی تھی، مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”حسان، یہ لیس نا!“ اس نے مجھے صرف ایک دفعہ فش کھانے کی آخر کی ٹکڑی نفی میں سر ہلا کر اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔ میں مچھلی نہیں کھاتا تھا، اس لیے اس نے دوبارہ نہیں کہا۔

چند لمحوں کھا کر ہی میں اٹھ گیا۔

”کیا ہوا؟ اچھا نہیں لگا کیا؟“ مجھے اٹھتا دیکھ کر مومو نے حیرت اور فکر مندی سے مجھے دیکھا تھا۔ صارم اسی طرح رات بھر سے کھانا کھاتا رہا۔

”ہیس، اچھا ہے۔ بس میرا پیٹ بھر گیا ہے۔ اچھا میں سونے جا رہا ہوں۔“ میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

مجھے افسوس تھا کہ آج ہم دونوں واک پر نہیں گئے تھے۔ کئی سالوں کی روٹین آج صارم کی وجہ سے ٹوٹی تھی۔ پتا نہیں اور کیا کیوں نا ہوتی تھا۔



چھٹی کے دن میں دیر سے اٹھا تھا، پھر بھی مومو کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ مجھے صبح سویرے اٹھا کر واک پر لے جائے۔ مومو صبح کی واک شام کی واک کی طرح روز نہیں کرتی تھی بلکہ صرف چھٹی والے روز کرتی تھی۔ میں درگنگ ڈیز میں واک پر جاتا تھا اور چھٹی والے دن عموماً سونا پسند کرتا تھا مگر مومو ہمیشہ اٹھا دیتی تھی۔

اس چھٹی کے روز اس نے مجھے نہیں اٹھایا اور میں خود ہی اٹھ سوا اٹھ بجے جاگ گیا۔

منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے نکلا تو صارم اور مومو کچن میں غڑے تھے۔ مومو آٹا گوندھتے ہوئے بہت دھیان سے

صارم کی گریجویشن کا کوئی قصہ سن رہی تھی، جبکہ وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی جس سے وہ آلیٹ کے لیے پیاز کاٹ رہا تھا۔

میں خاموشی سے آکر ٹونگ روم کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔ ان دونوں کی میری جانب پشت تھی۔

”اب آگے کیا کرو گے؟ لاء؟“ مومو اسے مخاطب کر کے پوچھتی ہوئی بقیہ آٹا فریج میں واپس رکھنے کے لیے پلیٹی ہی تھی کہ دفعتاً اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں حیرت در آئی تھی۔ ”اتنی جلدی اٹھ گئے آپ؟“

پیاز کاٹتے صارم نے گردن پھیر کر مجھے دیکھا اور سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“ میں چاہنے کے باوجود بھی لمبے کو ثقافت نہیں کر سکا اور رخ موڑ کر مومو کو مخاطب کیا۔ ”واک پر نہیں چلتا؟“

”آج رہنے دیں حسان، آج تو صارم آیا ہوا ہے۔“

وہ سمولت سے کہہ کر صارم کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔ اس کی بڑی بھوری آنکھوں میں ایک عجیب سا رنگ تھا جو میرے لیے انوکھا تھا۔ یہ بہت پیار بھرا مگر منفرد سا رنگ تھا۔

”کل بھی واک میں کر دی تھی۔“ میں نے دبا دبا شکوہ کیا۔ مجھے کوئی پروا نہ تھی کہ صارم لب بلبھتے تمام لکٹو سن رہا تھا۔

”اس اوکے حسان، واک تو ہوتی رہے گی، مگر صارم تو صرف چند دنوں کے لیے آیا ہے۔“ اس کے انداز میں اطمینان تھا، میں اندر ہی اندر ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو چکا تھا۔

میں لوگ روم میں صوفے پر بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگا۔ کوئی نئی خبر نہ تھی۔ ایل ایف او، صدارتی انتخاب، صدر کے برودی اتارے کا باڈ، عراق جنگ۔

کچن سے مومو اور صارم کی باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

میں نے اخبار قدرے بے زاری سے میز پر پھینک دیا اور تیزی سے داخلی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ مومو مجھے بھدائیوں روکتی، اس کے خیال میں، میں واک پر جا رہا تھا۔



”میں تو جیلنسی کے ساتھ ہوں اور آپ۔؟“



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیش کش

(WWW.PAKSOCIETY.COM)

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے آپ کیلئے پیش کیا۔

ہم خاص کیوں ہیں؟؟؟؟

یہ واحد ویب سائٹ ہے جہاں سے تمام ماہنامہ ڈائجسٹ، ناول، عمران سیریز، شاعری کی کتابیں، بچوں کی کہانیاں، اور اسلامی کتابیں ڈائریکٹ ڈاؤن لوڈ کرنے کے ساتھ ساتھ آن لائن پڑھ بھی سکتے ہیں۔



fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

اگر آپ کو ویب سائٹ پسند آئی ہے تو پوسٹ کے آخر میں اپنا تبصرہ ضرور دیں۔

اپنا تبصرہ صرف پوسٹ تک محدود رکھیں۔ درخواست کے لئے رابطہ کا صفحہ استعمال کریں۔

اپنے دوست احباب کو بھی پاک سوسائٹی کے بارے میں بتائیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی انتظامیہ سے مالی تعاون کیجئے۔ تاکہ یہ منفرد ویب

سائٹ آپ کیلئے جاری رکھی جاسکے۔

پاکستانیوں کے ویب سائٹ

WWW.Paksociety.Com



Library For Pakistan

دور تھی۔
دروازہ کھلنے کی آہٹ پر مجھے اندازہ ہوا کہ مومو کمرے میں داخل ہوئی ہے۔
”حسان! کیا ہوا ہے؟“ وہ میرے قریب بیٹھ گئی۔
اس کے لہجے میں فکر مندی تھی۔
میں نے آنکھوں سے بازو نہیں ہٹایا مگر اس کی آواز سن کر میرے اندر لگی آگ پر ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی تھی۔
میری مومو نہیں بدلی تھی۔ وہ ویسے ہی تھی۔
”حسان! اس نے زبردستی میری آنکھوں سے بازو ہٹا دیا۔ میں نے خاموشی سے اسے دیکھا۔
”کیا ہوا ہے؟“ آپ اٹھ کر کیوں آگئے؟“ اس نے آہستہ سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر میری طبیعت چیک کرنے کی سعی کی۔
”مجھے نیند آئی ہے۔“
”آپ کو شاید برا لگا کہ میں نے صارم کی سائیڈ کیوں لی۔ ہے نا؟“ وہ میرے دل کی بات جان گئی تھی۔ میں نے جواب نہیں دیا۔
”وہ بہت Sensitive ہے حسان! اگر میں اسے تنہا چھوڑ دیتی تو وہ ہرٹ ہوتا۔“ وہ دھیرے سے میرے ماتھے پر آئے ہاتھ کو ہٹا کر بولی تھی۔
”کیا وہ واقعی نہیں بدلی تھی؟ اسے صارم کے ہرٹ ہونے کی پروا بھی مگر میرے ہرٹ ہونے کی نہیں۔“ دل نے کہا تھا۔
”یہ بھی تو دیکھو کہ وہ تمہاری پروا کرتے ہوئے پریشان ہو کر اندر آئی ہے۔“ میرے اندر جیسے کسی نے مجھے سمجھایا۔ میں قدرے مطمئن سا ہو گیا۔
”اگس! اوکے مومو! میں ٹھیک ہوں۔ مجھے واقعی نیند آرہی ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا تو وہ کھڑی ہو گئی۔
”اچھا چلیں پھر آپ سو جائیں۔“
”اور تم؟“ میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔
”صارم کہہ رہا تھا کہ اسے پرانی کینڈا والی البم دکھاؤں تو اب بیچ ختم ہونے کے بعد وہی دکھاؤں گی۔ کچھ دیر لگ جائے گی مجھے۔ پھر باتیں بھی تو بہت کرنی ہیں۔“ وہ کہہ رہی تھی اور میرے اندر دل و دماغ کی جنگ ایک دفعہ پھر چھڑ چکی تھی۔
پتا نہیں وہ کون سی باتیں تھیں جو ان تین دنوں میں ان لوگوں نے نہیں کی تھیں۔

صارم کی آواز پر میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ وہ لونگ روم میں بیچے کاریٹ پر رکھے کٹن پر بیٹھا مومو سے مخاطب تھا۔ میں نے ٹی وی اسکرین کو دیکھا، جبلسی اور مائچسٹر یونائیٹڈ کا بیچ آرہا تھا۔ میں نے فوراً ”اخبار سائیڈ پر رکھ دیا۔“
”مائچسٹر یونائیٹڈ کا بیچ ہے؟“ قدرے خوشی سے میں نے ریسمون اٹھا کر آواز اونچی کی۔ مائچسٹر یونائیٹڈ میری فیورٹ ٹیم تھی۔
مومو ہاتھ میں چلغوزوں کی پلیٹ لے آئی تھی۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ وہ چلغوزوں کی ڈش خود لے کر ایک ایک چلغوزہ نکال کر مجھے پکڑایا کرتی تھی، خود وہ کبھی نہیں کھاتی تھی۔ وہ صوفے پر میرے ساتھ بیٹھ ہی رہی تھی کہ صارم نے پوچھ لیا۔
”آپ کس کے ساتھ ہیں، ممر؟“ وہ مومو کو مہرکتا تھا اور یہی بات تھی جو مجھے بری لگتی تھی۔ ٹھیک ہے۔ دونوں کزنز تھے اور آپس میں از حد بے لگافی تھی مگر اس کو خود سے عمر میں بڑی مومو کو ”آپی“ یا ”باجی“ کہنا چاہیے تھا لیکن وہ نڑکا۔
”کس کا بیچ ہے؟“ مومو نے ٹی وی اسکرین کو غور سے دیکھا۔ جب بھی کسی فٹ بال کلب کا بیچ ہوتا تھا میں اور مومو ہمیشہ مائچسٹر یونائیٹڈ کے ساتھ ہوتے تھے۔ مجھے پتا تھا اب بھی وہ میرے ساتھ ہی ہوگی۔
”جبلسی اور ایم یو کا۔ میں جبلسی کے ساتھ ہوں، اور آپ؟“ وہ گردن موڑے پوچھ رہا تھا۔
”چلو میں بھی جبلسی کے ساتھ ہوں۔ خوش؟“ اس نے مسکراتے ہوئے چلغوزے کی گری نکالی۔ صارم نے آگے ہاتھ بڑھایا۔ مومو نے گری اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔
اس لمحے مجھے اپنا وجود اتنا غیر ضروری بے وقعت اور بے مول لگا تھا کہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کتنی آسانی سے مومو نے کہہ دیا تھا کہ وہ جبلسی کے ساتھ ہے، وہ کتنی جلدی میرا ساتھ چھوڑ کر صارم کے ساتھ مل گئی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی تھی اور اس سے زیادہ دکھ ہوا تھا۔
”میرا خیال ہے مجھے نیند آرہی ہے۔“ اخبار میز پر رکھ کر میں کنبلیے لہجے میں کہتا ہوا اندر کمرے میں آگیا۔ میرے اندر بہت کچھ نوٹ پھوٹ رہا تھا۔
میں نے بستر پر لیٹ کر کمرے کی اوڑھ لیا اور بازو سے آنکھیں ڈھانپ لیں۔ مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں

”آپ میرا انتظار مت کیجیے گا۔ سو جائیے گا۔“
اس نے کبل ٹھیک سے میرے اوپر ڈالا۔ لائٹ آف کی اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے چلی گئی۔
”الیکٹرک ایکسیس کا شکار عورت جب عمر کی تیسری دہائی میں پہنچتی ہے تو اس کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ اس کو اپنے سے آدھی عمر کے لڑکوں میں۔“ میں نے سر جھٹکا۔
کافی عرصے پہلے کتابوں میں پڑھی باتیں یاد آ رہی تھیں۔
مگر مومو کو تو الیکٹرک ایکسیس نہیں ہے۔ وہ ایک نارمل لڑکی ہے۔ اس نے مجھ سے محبت کی شادی کی ہے کسی نفسیاتی گروہ کے باعث یہ بندھن نہیں باندھا۔
”محبت کی شادی؟“ کوئی جیسے میرے اندر ہنسا تھا۔
”بہسی خود کو آئینے میں دیکھو کیا تم اس کے ساتھ سوٹ کرتے ہو؟“
وہ رات بھی بے چینی سے کروٹیں بدلتے گزری۔

حالا تک اس روز یونیورسٹی میں زیادہ کام نہیں تھا پھر بھی میں نجائے کیوں بے حد تھک گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ دل و دماغ عجیب بوجھل بن کا شکار تھے۔ فضول دوسوئوں سے جتنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا وہ اتنا ہی مجھے گھیر لیتے تھے۔

گھر آیا تو مومو ہمارے بید روم میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی کانوں میں بندے پس رہی تھی۔ اس نے بال کھول رکھے تھے اور غالباً ”انہیں بلوڈرائی کر کے سینٹ بھی کیا تھا“ اور ہلکا سا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ کافی ہنگ شغون جارحیت کے ڈریس میں وہ جی سنوری سی بہت دلکش لگ رہی تھی۔

”بہت اچھی لگ رہی ہو مومو!“ بہت عرصے بعد اسے یوں اپنے لیے سچا سنورا دیکھ کر میری جیسے پورے دن کی جھٹکن دور ہو گئی تھی۔

اس نے گردن پھیر کر مجھے دیکھا پھر اپنے مخصوص دلنشین انداز میں مسکرائی۔ ”میں تو ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہوں۔“ اس کا لہجہ شوخ تھا۔ میں ایک دم چونکا۔

مومو ایسی شوخ کبھی بھی نہیں رہی تھی۔ بہت کم عمری میں وہ بوڑھوں کی طرح سنجیدہ رہنے لگی تھی، لیکن پچھلے کچھ دنوں سے اس کی آواز میں ایک کھٹک سی در آئی تھی۔ وہ مجھے پچھلے آئند برسوں کے مقابلے میں زیادہ خوش اور

زیادہ جوان لگی تھی۔
”بہت خوش لگ رہی ہو؟ بظاہر میں مسکرا رہا تھا مگر اندر سے میں ناخوش تھا۔

”ہوں۔“ اس نے مسکرا کر شانے اچکا دیے پھر دہریے کندھے پر سیٹ کر کے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر بولی۔ ”میں صحیح لگ رہی ہوں نا؟ حسان؟“

میں نے اس کے پیچھے سے آکر اس کے دونوں کندھوں کو تھام لیا۔ ”بہت اچھی لگ رہی ہو مومو۔“ آئینے میں مجھے اس کا خوبصورت چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

”آپ چلیں گے؟“ بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں ایک دفعہ پھر سیٹ کرتے ہوئے وہ مصروف سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”وہ میں بتانا بھول گئی۔ میں اور صارم دامن کوہ جا رہے ہیں اس کو میں دراصل پاکستان گھماتا چاہ رہی تھی۔ آپ چلیں گے ساتھ؟“

اس کے شانوں پر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ”تو تم اس لیے تیار ہو رہی تھیں؟“

”جی۔ آپ آئیں گے؟“ اس نے گردن میں موجود فیکلٹس کو ٹھیک کیا۔

میں نے اپنے ہاتھ ایک دم اس کے شانوں سے ہٹا دیے۔ ”نہیں، تم جاؤ۔“ میں اپنے کپڑے نکالنے الماری کی جانب بڑھ گیا۔ میرے اندر ہی اندر کوئی مجھے برچھیوں سے زخمی کر رہا تھا۔

”چلیں۔ آپ کی مرضی۔“ اس نے پرس اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ ”کھانا کھا لیجیے گا، ہم تو شاید رات دیر سے آئیں۔“ وہ مجھے جاتے ہوئے ہدایات کر رہی تھی میں خاموشی سے الماری میں کپڑے ادھر ادھر کرتا رہا۔

”مہرب چلیں نا!“ باہر سے صارم کی آواز آئی تھی۔
”ارے آ رہی ہوں نا اچھا حسان خدا حافظ!“ وہ جگت میں کہتی وہاں سے چلی گئی۔

میں الماری کا پٹ کھلا چھوڑ کر کھڑکی کی جانب آیا اور پردہ سرکایا۔ وہ دونوں ہنستے بولتے باتیں کرتے گاڑی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش تھے اتنے خوش کہ انہیں میری کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

میں خاموشی سے بہت خاموشی سے ان کو دیکھتا رہا۔

”صبح سو کر اٹھا تو لوگ روم سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی زاریں آ رہی تھیں۔ میں ان دونوں آوازوں کو پہچانتا تھا۔“

”اگر اس کا گزن چند دن کے لیے آئی گیا ہے تو مجھے یوں جنسی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بے چارہ آخر میرا نبیالتا ہے؟“ میں نے اپنے دل کو صارم کی طرف سے نرم کرنے کی کوشش کی۔ ”مجھے ان کے ساتھ جاکر مہمان ری بچانی چاہیے۔“ یہی سوچ کر میں اٹھا اور فریش ہو کر باہر چلا آیا۔

رات وہ دونوں دامن کوہ اور شکر پریاں سے خاصے دیر سے لوٹے تھے۔ مومو آئی تو میں سوتا بن گیا اس نے بھی مجھے نہیں جگایا۔ حالانکہ اسے علم ہونا چاہیے تھا کہ میں رات دو تین بجے سے قبل نہیں سوتا تھا سب سے پہلے وہ اپنا نیند ہی تو چراتا ہے۔

میں فضول خیالات کو ذہن سے جھٹک کر لوگ روم میں تو مومو اپنا کینوس اور ایزل سیٹ کر کے کھڑی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں برش تھا جبکہ دوسرے میں پینٹ کی پیٹ۔

صارم اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔
”کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے لمبے کو خوشگوار بناتے ہوئے پوچھا۔

”مومو جو بہت غور سے کینوس کو دیکھ رہی تھی میری بات پر چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

”صارم کا پورٹریٹ بنا رہی ہوں۔ بات مکمل کر کے وہ فرش سے کینوس پر اسٹوک لگاتے لگی۔

”میں جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ میرے دل دماغ میں ندھیاں سی جلنے لگی تھیں۔

مومو نے بھی میرا پورٹریٹ نہیں بنایا تھا، کتنی فتن کی فتن میں نے اس کی عمر وہ نہیں بنائی تھی۔ اور اب۔۔۔ وہ صارم کا پورٹریٹ بنا رہی تھی۔ کیا اس کے لیے صارم مجھ سے زیادہ اہم تھا؟

میں کچن کی جانب بڑھ گیا۔ میں آئینہ نہیں دیکھ رہا تھا، مجھے معلوم تھا کہ میرا چہرہ دل بھر میں تاریک پڑ گیا تھا۔

یہ اندورنی توڑ پھوڑ ایک بار پھر سے شروع ہو چکی تھی۔ ”مومو۔ ناشتا!“ میں نے اسے پکارا تو آواز میں خود بخود تڑپ بے زاری سمٹ آئی تھی۔
”میز پر لگا دیا ہے حسان بس لو نہیں صارم!“ اس کی آواز نے کینوس پر تھپی۔

واقعی میز پر ہر شے سیٹ تھی۔ میں ناشتا کر کے اٹھا تو کمرے میں استری شدہ کپڑے اور پالشڈ جوتے پہلے سے رکھے تھے۔ میرا ہر کام وہ اب بھی اتنی ہی تندہی سے کرتی تھی جیسے صارم کے آنے سے پہلے کرتی تھی۔ مگر اب اس کی توجہ بٹ چکی تھی۔ اور مجھے اس کا صارم کو اہمیت دینا ایک آنکھ نہیں بھارا تھا۔ مجھے مومو مکمل چاہیے تھی مگر وہ بہت مصروف تھی۔
میں اس سے کوئی بات کہے بنا ہی چلا گیا۔

”تمہیں یاد ہے صارم! جب میں کینیڈا میں ہوتی تھی تو اکثر حسین خاٹہ کے پوچھے بغیر تمہیں باہر لے جاتی اور۔۔۔“

مومو اور صارم پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے۔
میں لوگ روم میں رکھے بڑے صوفے پر بیٹھا بظاہر ہنسی دیکھ رہا تھا مگر توجہ ان ہی کی طرف تھا۔

مومو میرے ساتھ والے صوفے پر بیٹھی تھی اور صارم ہمیشہ کی طرح اس کے قدموں کے قریب رکھے کپڑے پر بیٹھا بہت توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی نظریں مومو کے چہرے پر تھیں اور مسلسل مسکرائے جا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں سے مجھے اچھن ہو رہی تھی۔

”تمیں بہت چھوٹا تھا اس وقت اس لیے یاد نہیں ہجر مجھے وہ بسکٹ پھر بھی یاد ہیں جو آپ نے بنائے تھے۔“

مومو نے بے اختیار قہقہہ لگایا تھا۔
”دھی اکثر ان بسکٹوں کا قصہ سناتی رہتی ہیں۔“ صارم مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا اور میں اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔

”مہرب! آج پھر دھی بسکٹ بنائیں نا؟ اسی دم صارم نے بچوں کی طرح کھانا مومو نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”چلو بنا لیتے ہیں ویسے میں نے بڑا عرصہ ہوا بسکٹ نہیں بنائے لیکن چلو اب تمہارے لیے بنا لیتے ہیں۔“ وہ کچن میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی صارم بھی اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

”مگر آدھا کام تم کرو گے سمجھے؟“ وہ اب مختلف اشیاء نکال کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
”ہاں جی میں آپ کا خادم جو کھرا۔ مفت کا خادم۔“ وہ کچھ جل کر بولا۔ مومو بے اختیار ہنس دی۔

کچن میں کچھ پکاتے وقت مومو اکثر دوشہ اتار دیتی تھی

جیسے دو سری خواتین کرتی ہیں۔ ویسے بھی گھر میں صرف ہم دو ہی ہوتے تھے کوئی مرد ملازم تو تھا نہیں۔

لیکن اس وقت مجھے کرنٹ لگا جب صارم کے ساتھ بسکٹ بناتے ہوئے مومو نے لاپرواہی سے کندھے پر لہراتا دوپٹہ اتار کر سائیڈ پر رکھ دیا اور دونوں آستینیں کھینچیں تک فولڈ کر لیے۔

”آپ اس عمر میں بھی کتنی اسماٹ ہیں مہر!“ صارم بے اختیار کہہ اٹھا تھا اور میں بے یقینی سے اپنی ”حیادار“ بیوی کو دیکھ رہا تھا جو مسکراتے ہوئے تعریف و موصول کر رہی تھی۔

جس مومو کو میں جانتا تھا وہ باہر سرور دہشتہ تو نہیں لیتی تھی مگر جسم کو اچھی طرح ڈھانپ لیتی تھی۔ کسی دوسرے مرد سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں سختی در آتی تھی۔

وہی مومو صارم کے ساتھ ایسے کھڑی تھی؟ ٹھیک ہے کہ وہ اس کا زین تھا اور چھوٹا تھا مگر اس کو آبی یا باجی نہیں کہتا تھا۔ وہ نامحرم اور جوان تھا کوئی بچہ نہیں تھا۔

میں مومو کو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں اس سے کیا کہتا؟ میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ بالآخر میں ریموٹ صوفے پر پھینک کر تیزی سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ مومو اپنی مصروفی تھی کہ اسے میرے پیچھے آنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

ان دنوں میں بہت چڑچڑا اور بے زار رہنے لگا تھا۔ ہر وقت میرا دماغ فضول وسوسے بناتا رہتا میں جتنی کوشش کرنا کہ ان سے بچھا چھڑاؤں وہ اتنے ہی میرے دماغ کو جکڑ لیتے۔ اور کبھی کبھی مجھے وہ فضول نہیں ”درست“ لگتے تھے۔

مومو بدل رہی تھی۔ وہ میری مومو نہیں رہی تھی۔ وہ اب صارم کی مرزبانی جاری تھی۔

صارم سبزی نہیں کھاتا تھا وہ اب چکن بناتی تھی۔ صارم کو پرفوم بہت اچھے لگتے ہیں وہ جناح سیر سے کتنے ہی پرفومز اس کے لیے لے آتی تھی۔ صارم کو بلیو اور گرے ٹھہرا چھا لگتا ہے مومو ان رنگوں کی بے تحاشا شرمیں خرید کر اسے گفٹ کر چکی تھی۔ اس کی زبان پر نام ہوتا تو صرف صارم کا اس کو خیال ہوتا صرف صارم کا۔

وہ بن بلایا مہمان اگر ٹھیک سے کچھ نہ کھاتا تو مومو پریشان ہو جاتی۔

”کھا کیوں نہیں رہے؟ میں کچھ اور بنا دوں؟“ اور وہ منع بھی کرتا تب بھی وہ اس کے لیے مچھلی تلنے لگتی۔ مومو کو پراٹھے بنانا بہت برا لگتا تھا اور اب پچھلے تین ہفتے سے وہ روز صبح صارم کے لیے پراٹھے بناتی تھی۔ صارم کا نام لیتے ہوئے اس کی آواز میں بے حد نرمی اور آنکھوں میں ایک پیار بھرا تاثر ہوتا تھا۔ میں اس تاثر کو کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔ میرے دماغ میں بار بار خطرے کی گھنٹی بجتی تھی مگر میں اس کو سننے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ شاید میں بے غیرت ہو گیا تھا۔

اپنی اسی ذہنی کیفیت کے باعث اس روز ان آٹھ برسوں میں مومو سے میری پہلی لڑائی ہوئی۔

میں نے اس سے رات کو کہا تھا کہ وہ میری سفید شرٹ استری کرے مگر اس نے گرے والی کر دی تھی۔

”یہ کیوں کی ہے؟ میں نے تمہیں بتایا تو تھا!“ بات اپنی بڑی نہیں تھی مگر میرے اندر اسنے والے لاوے کو راست مل گیا تھا۔

”اوه سوری حسان! وہ میں صارم کی گرے شرٹس لائی تھی نا تو میرے ذہن میں وہی تھی۔“ وہ ہنس کر اپنی بے وقوفی بتا رہی تھی۔

”میں صارم نہیں ہوں مومو!“ ایک دم میں شرٹ پھینک کر غصے سے بولا تھا۔

اس نے قدرے حیرت سے مجھے دیکھا ”حسان!“

”میں صارم نہیں ہوں میں تمہارا غام شکل و صورت والا بوڑھا شوہر ہوں۔ تم کیوں بھول جاتی ہو؟“ میری آواز میں زہر بھرا تھا۔

”حسان! میرے ذہن میں نہیں رہا میں۔“ وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ ڈانٹ سنے وقت وہ ایسی ہی ہو جاتی تھی۔

”ہاں تمہارے ذہن میں صارم کے علاوہ اور روکون سکتا ہے۔ تمہیں کہاں اپنا چھپن سالہ شوہرا ہو گا؟“ میں نے استہزائیہ انداز میں اسے دیکھا تھا وہ ابھٹک کر بھری حیران لگا ہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔

”سنو یہ میرا گھر ہے سرائے نہیں ہے۔ تم یہیں سے کہو وہ اپنے بیٹے کے لیے الگ گھر لے لے۔ بہت کمنا ہے اس کا شوہر۔ مگر خدا کے لیے میری لائف ڈسٹرب نہ کرے۔“

”حسان!“ وہ شائد تھی۔ ”آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ بے چارہ چار دن بعد چلا ہی جائے گا میں خالہ کو کیسے کہہ سکتی ہوں؟“

”میں اسید رکھوں گا کہ چار سے پانچ دن نہ ہوں ورنہ بہن سے خودی کہہ دوں گا۔“

اپنی سفید شرٹ اٹھا کر میں واش روم میں گھس گیا۔ یہ امری میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی تھا کہ صارم چار دن بعد میرے گھر سے دفع ہو جائے گا۔ مجھے ایک کمینسی سی خوشی ہوئی تھی۔

وہ صبح بہت عجیب تھی۔ میں ایک اچھی نیند لے کر اٹھا تو پتہ نہیں کیوں مجھے فضا میں کسی انہونی کی بو آئی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہوا مجھے کوئی پیغام دے رہی ہو۔

دل بھی عجیب سا ہو رہا تھا طبیعت اور بھی بے زار تھی میں نے ڈرننگ روم سے اپنے کپڑے اٹھائے اور نمائے چاہا گیا۔

یونیورسٹی کے لیے تیار ہو کر نکلا تو یونی آئینے میں ایک نگہ خود پر ڈالی۔

”گندمی رحمت“ غام نقوش، کپٹیوں کے سفید بال، گھٹھوں کے گرد بے تحاشا بھریاں۔ میں مومو کے ساتھ ”سوٹ“ نہیں کرتا تھا۔

سر جینٹل کمر میں اپنی کتابوں کی جانب رہے گیا تب مجھے یاد آیا کہ رات میرے پن کی بٹ ٹوٹ گئی تھی۔

”ہو سکتا ہے مومو کے پاس کوئی پن بڑا ہو جس سے میں آج کے دن کام چلا لوں۔“ مگر مومو صارم کے لیے پراٹھے بناتی تھی۔ میں اس سے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے اس کی الماری کی جانب بڑھ گیا۔

اس کی الماری میں چار خانے کپڑوں کے تھے۔ پہلا ایک دراز تھی اور سب سے نچلا خانہ جوتوں کا تھا۔ مجھے یہیں غم تھا وہ اپنی چیزیں کدھر رکھتی تھی۔ میں نے اس دراز کھول لی۔ وہاں بے تحاشا برش پینٹنس کے ڈبے، کل پینٹنس کی شیشیاں، رولز، پینسلز اور بہت سے لٹریچر رکھے تھے۔ میں الٹ پلٹ کر کوئی قلم تلاش کرنے لگا۔

ایک دم میرے ہاتھ کسی شیشی سے ٹکرائے۔ میں نے اسے اُٹھایا۔ پینٹ کی شیشی سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہا مگر

دفعہ ”میری نگاہ اس شیشی پر لگے لیبل پر پڑی۔ وہ آئل پینٹ کی شیشی نہیں تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر اس کا نام پڑھا۔ اور اس لٹھے ہاں یہ وہی لمحہ تھا جب میری بہت خوشگوار زندگی بر باد ہو گئی تھی۔

میں نے اس کا نام پڑھا، زمین اور آسمان میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے تھے۔ مجھے چکر سا آیا میں نے دیوار کو تھام لیا اگر نہ تھامتا تو گر جاتا۔

مگر گرتو میں گیا تھا۔ میں آسمان سے زمین پر چٹا گیا تھا۔

وہ شیشی جو میرے ہاتھ میں تھی جو مجھے اپنی حیادار وفا شعار بیوی کی الماری سے ملی تھی وہ برتھ کنٹرول پیلسٹک کی تھی۔ بہت سے مناظر بہت سی باتیں اور بہت سی سسکیاں مجھے یاد آئی تھیں۔

”میں بانجھ ہوں حسان! میں آپ کو اولاد نہیں دے سکتی۔“ وہ روتے ہوئے کہتی تھی۔

”میں ہاں نہیں بن سکتی نا“ وہ کہہ سکتی تھی۔

کسی دوسرے کے بچے کو دیکھ کر روتی تھی کمرہ بند کر کے پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی۔

میں نے آپ کو بتایا تھا، میری بیوی بہت اچھی اداکارہ تھی۔ وہ مجھے پچھلے آٹھ برسوں سے مسلسل بے وقوف بناتی آرہی تھی۔ وہ مجھ سے کہتی تھی میں بانجھ ہوں اور میں آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتا تھا۔ اس نے مجھے کبھی اپنی رپورٹس نہیں دکھائی تھیں اس نے کبھی کسی قسم کے علاج کی بات نہیں کی تھی۔

اگر آپ کو میری بات پر کوئی جھٹکا لگا ہے تو میں اصل بات آپ کو بتاتا ہوں۔ مومو دراصل کبھی میرے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ نفسیاتی مریض تھی۔ ہو سکتا ہے اس کی ہمدردی اور محبت میں آپ اس بات کو بھلا چکے ہوں مگر میں نہیں بھولا تھا۔

مجھے یاد تھا مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ وہ الیکٹرک کیکس کا شکار تھی اور وہ خود بھی یہ بات جانتی تھی۔ اسے پتا تھا وہ ساری عمر میرے ساتھ نہیں رہ پائے گی۔ بڑھتی عمر اس کے احساسات کو الٹا دے گی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا، مومو ایک بہت سمجھ دار لڑکی تھی۔ اسے علم تھا کہ میں چالیس برس کی عمر میں کوئی نوجوان ایسا ہو گا جس کے آگے وہ ہار جائے گی۔ اس سمجھ دار لڑکی نے بہت سمجھ داری سے ساری پلاننگ کی تھی۔ وہ ہاں بن سکتی تھی مگر وہ ہاں بننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اولاد کی زنجیر کو پاؤں میں نہیں ڈالتا

چاہتی تھی۔ اس کو معلوم تھا ایک نہ ایک دن وہ مجھے چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اپنی نفسیاتی جس کی تسکین کے لیے اس نے اپنی مستقر بن کر ڈالی تھی۔ یہ وہ احساس جرم تھا جو اسے سکون سے سونے نہیں دیتا تھا۔ بانجھ عورتیں کمرہ بند کر کے چیخ چیخ کر رویا نہیں کرتیں۔ وہ اکثر نیند میں بڑبڑاتی تھی۔

"I donot wanna dothis"
"some one help me please!"

اس کا احساس جرم اسے کچھ کے لگا تھا کیونکہ بنیادی طور پر وہ ایک مخلص لڑکی تھی مگر اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے وہ بہت آگے نکل چکی تھی۔ کتنی ہی دیر شیشی ہاتھ میں تھا بے میں اسے دیکھتا رہا۔ میرے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔

جو تیس برس میں نے اس عورت سے محبت کی۔ چونتیس برس میں سمجھتا رہا کہ میری ماں مجھے چھوڑ سکتی ہے، تنگی پر تادم بے وفائی کر سکتی ہے، مگر مومو کبھی ایسا نہیں کرے گی۔

اگر مجھ میں غیرت اور عقل ہوتی تو پچھلے تین چار ہفتوں سے جو میرے گھر میں ہو رہا تھا وہ مجھے چھوڑنے کے لیے کافی تھا۔ مومو کا صارم کے لیے التفات میری نگاہوں سے چھپا نہ تھا۔ مگر پھر بھی میں خود کو کوس کر اپنی شکی طبیعت کو مورد الزام ٹھہرا کر خاموش ہو جاتا تھا۔

مگر وہ شیشی۔ اس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔

بست دیر میں دیوار کے سہارے ٹیک لگائے، ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ کھڑا رہا، پھر جیسے کچھ ہوش آیا تو میں نے انگلیوں میں جکڑی مانع حمل گولیوں کی شیشی حبیب میں ڈال لی۔

بست تھکے تھکے قدموں سے چلتے ہوئے میں باہر آیا تھا۔ مومو اور صارم کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ میں نے ان کو نہیں دیکھا، میں نے کسی کو نہیں دیکھا، میں صرف زمین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں گمن تھے وہ جوان تھے، زندگی ان کے لیے ہستی مسکراتی تھی، اور میں بوڑھا، بے وقوف، مرد دھیرے دھیرے چلتا ہوا باہر آیا۔

میں یونیورسٹی نہیں جا رہا تھا مجھے خود نہیں علم تھا میں کہاں جا رہا ہوں، تمام راستے انجانے لگ رہے تھے۔ جن راستوں کا میں راہی تھا انہوں نے مجھے کہاں پہنچا ڈالا تھا۔

تا نہیں کب اور کیسے میں چلتا ہوا پارک آ پہنچا۔ یہ دشن پتھر کی روش تھی جہاں میں چودہ برس کی اس لڑکی کے ساتھ جاٹنگ کیا کرتا تھا۔ وہ لڑکی کدھر چلی گئی؟ میں اسے کہاں ڈھونڈوں؟

میں ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میرا سب کچھ تو لٹ چکا تھا۔ میری واحد متاع "ٹیک بیوی" تھی، جواب کہیں بھی نہیں تھی۔ میں، چھپن سالہ بی بی ایچ ڈی ڈاکٹر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا، مگر مومو نے تو مجھ سے آنسو بھی چھین لیے تھے۔ میں نے اس کو کئی برس پہلے "آئی بیٹ یو" کہا تھا، وہ اس دن بہت روتی تھی، اور پھر اس نے بہت اچھا انتقام لیا تھا۔

"رضوی صاحب کی بیوی کا پتا ہے، تم لوگوں کو؟" میری سماعت سے ایک منہر آواز نکلانی۔

جس درخت کے ساتھ میں کھڑا تھا، اس کے پیچھے بیچ ہمارے کالونی کے چند مسٹر، ماسٹر، بوڑھے روز کی طرح گپ شپ کے لیے جمع تھے۔ میں درخت کی اوٹ میں تھا، ان کی دیکھ بھی میری جانب پشت تھی، وہ۔۔۔ میری موجودگی سے لاعلم، سی فائبر والے رضوی صاحب کو ڈسکس کر رہے تھے میری ذہنی کیفیت مجھے ان کی کوئی بات نہ سننے دیتی، اگر میں عارف صاحب کا اگلا فقرہ نہ سنتا۔

"ہاں بھئی، رضوی صاحب نے گھر سے نکال دیا ہے۔ جن دنوں وہ فیکٹری کے کام سے فیصل آباد گئے تھے، ان کی بیوی ان کے دوست کے گھر آتی جاتی تھی۔ ان کے ڈرائیور نے رضوی صاحب کے آتے ہی بتا دیا۔ اب بتاؤ، گنوارے، اکیلے رہنے والے مرد کے گھر میں بھلا اس عورت کا کیا کام؟"

"ہاں بھئی، دنیا بڑی فریبی ہے۔ شکلیں جتنی معصوم ہوتی ہیں، کثرت اتنے ہی گھٹاؤنے۔ اب یہ ڈاکٹر صاحب کی جوان بیوی کو ہی دیکھ لو،" صبح صاحب کہہ رہے تھے اور مجھے لگا، میں اگلا سانس نہیں لے سکوں گا۔

"کون ڈاکٹر صاحب؟" عارف صاحب کو یاد نہیں تھا۔ "سی ٹائن والے ڈاکٹر حسان، جنہوں نے اس عمر میں جوان لڑکی سے شادی کی تھی۔ بھئی۔ ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا، ایسی غیر حقیقی اور غیر فطری شادیاں نہیں چلا کر تیں۔ بوڑھا مرد، جوان عورت کو نہیں سنبھال سکتا۔" مجھے لگ رہا تھا، کوئی مجھے چوک پر کھڑا کر کے کوڑے،

رہا۔۔۔ "کیا ہوا حسان صاحب کی بیوی کو؟ وہ تو بڑی اچھی ہے، نہ ر رہی بھائی، جب بیمار ہوئی تھیں، تو روز سوپ بنا کر بھیجا کرتی تھی۔"

"اورے بیٹے، ایسی ہی ہوتی ہیں۔ سوپ بنا کر، معصوم زائیں دکھا کر اپنے جال میں پھنسانے والی دیکھتے نہیں ہو، کیسے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس ولایت والے کزن کے ساتھ اور پھر رہی ہوتی ہے؟ ہم آنکھیں رکھتے ہیں میاں، کوئی بچے نہیں ہیں۔"

صبح صاحب کے الفاظ مجھے چھلنی کر رہے تھے، میرا دماغ رواں زخمی ہو چکا تھا۔

"صحیح کہتے ہو صبح! محبت بے غیرت اور بے وقوف بنا دیتی ہے۔"

یہ انتہا تھی، میں اس سے آگے نہیں سن سکتا تھا۔ میں بے وقوف تھا، میں بوڑھا تھا، مگر میں بے غیرت نہیں تھا۔ جس کو میں مفروضہ سمجھتا تھا، وہ چوک میں بیٹھے لوگوں کے لیے گوسپ بن چکا تھا۔

میرے اندر کا مرد جاگ اٹھا تھا۔ میں بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے ذرا خوں کے جھنڈے نکلا، اور ان دونوں کے پیچھے سے تیز قدم اٹھا، پارک سے نکل گیا۔

میرا رخ گھر کی جانب تھا۔ مجھے مومو سے بات کرنا تھی، مجھے اس سے صرف دو ٹوک بات کرنا تھی۔ میں مومو کو بخوڑنا نہیں چاہتا تھا، میں اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس کو معاف کرنے کے لیے تیار تھا۔ میں بوڑھا ہو چکا تھا، مجھے اس کی ضرورت تھی اسی قسم کے خیالات سے میں نے اپنے اندر کے غیرت مند مرد کو اندر ہی دفن کرنے کی کوشش کی، آپ مجھے بے غیرت کہیں، بچہ، آپ کہہ سکتے ہیں۔

بہت آہستگی سے میں نے گھر کا بیرونی دروازہ کھولا۔ بے نرم اٹھا تا میں اندر داخل ہوا، مومو اور صارم، میری آمد سے بے خبر تھے۔ ان کے خیال میں، میں یونیورسٹی جا چکا تھا۔

میں آگے بڑھنا چاہتا تھا، مگر لونگ روم کا منظر دیکھ کر مجھے سانس ہونا پڑا۔

میں نے پر صارم بیٹھا تھا۔ اس کے بہت قریب مومو

میں آنسو تھے۔ صارم کا دایاں بازو مومو کے شانوں کے گرد تھا۔

کبھی ان آنسوؤں سے میں بھی بار گیا تھا اور حیدر بھی۔ "میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں، صارم! وہ بھیگی آواز میں کہہ رہی تھی۔"

"مہرا آپ میری بات کیوں نہیں مان لیتیں؟ آپ میرے ساتھ کینیڈا آجائیں۔ میں وہاں جلد ہی الگ اپارٹمنٹ لے لوں گا، بس پھر میں ہوں گا، اور آپ۔ ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔"

"کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے میں سب کچھ چھوڑ چھاؤں، واقعی تمہارے ساتھ چلی جاؤں۔ مگر حسان۔۔۔ وہ متذبذب تھی۔"

"آپ ان کو ایک دفعہ بتا دیں، دو ٹوک انداز میں بتا دیں۔" وہ جیسے چڑ کر بولا تھا۔ "کیا بتاؤں؟"

"یہی کہ آپ ان جیسے خود غرض اور سیلف سینٹرڈ بندے کے ساتھ نہیں بلکہ میرے ساتھ رہنا چاہتی ہیں۔"

"صارم! ایسے مت کہو، میں ان سے بہت محبت کرتی ہوں۔" میرے دل میں خوش گمانیوں نے سراٹھایا تھا۔ "ٹھیک ہے، پھر میرے بغیر رہیں گی آپ؟" وہ جیسے تھا سا ہو گیا تھا۔

"نہیں رہ سکتی ناں، ایسی تو مسئلہ ہے۔ تمہارے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔ میں تو تمہیں دیکھ کر جیتی ہوں صارم! میں نے زندگی میں سب سے زیادہ محبت ہی تم سے کی ہے۔"

میری خوش فہمیوں کا گھڑا پھٹنا چور ہو گیا تھا۔ "حسان صاحب سے بھی زیادہ؟"

"آپ کو پسند صارم! کیا تمہیں شک ہے؟" اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

زندگی میں پہلی دفعہ مجھے مومو سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔ پہلی دفعہ میرا دل اس پر تھوکنے کو چاہا تھا۔

میں اوٹ سے نکلا۔ وہ دونوں میرے سامنے تھے، مگر انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔

"آئی لو بوٹو، مہرا! صارم اس پر جھکا تھا، مومو نے آنکھیں موند لیں، اس نے مومو کے ماتھے پر اپنے لب رکھ دیے۔

"میں نے بھی اس دنیا میں سب سے زیادہ آپ سے

محبت کی ہے۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔" وہ اس پر جھکا نہایت جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

"تو پھر لے جاؤ اپنی مرکو۔" ان دونوں کے بالکل سامنے آکر میں بلند آواز میں بولا تھا۔

کرنٹ کھاکر مومو اس سے علیحدہ ہوئی۔

"حسان آپ! وہ کھڑی ہو گئی، اس کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔ میں نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

اس نے بے اختیار کندھے پر آیا دہنادرست کیا، پھر قدرے گھبرا کر چہرے پر بکھرے بال سینٹے لگی۔ اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔

"تم اس کے بغیر نہیں رہ سکتیں، پھر چلی کیوں نہیں جاتیں؟" میں ایک قدم آگے بڑھا تھا۔

اس نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا، پھر جیسے جبراً مسکرائی۔

"آپ کب آئے؟ یونیورسٹی نہیں گئے، سنجے جلدی آگئے ہیں نا؟"

"نہیں مومو! مجھے تو بہت دیر ہو گئی ہے اس مقام تک آتے آتے!" میرا لہجہ سرد تھا۔

اس نے خوف زدہ ہو کر میرا چہرہ دیکھا، "لگ۔ کیا ہوا حسان؟"

میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر مارا۔ وہ لڑکھرائی۔

"جو نیتیں برس مومو، چونتیس برس میں نے تم سے محبت کی اور تمہیں تم گھٹا عورت۔" میں نے ایک اور زوردار تھپڑ مارا تو وہ چکر اکر گر گئی، میں نے اسے اپنے پاؤں میں موجود جوتوں سے بھی ٹھوک ماری۔

"ذلیل۔ بد کردار۔ حرافہ۔" میں اسے گالیاں بک رہا تھا۔ وہ صوفے پر گری، چپ چاپ پٹ رہی تھی۔

پھر ایک دم میں نے اپنا ہاتھ روک لیا، اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا، اس کا کیچر ٹوٹ چکا تھا، مگر مجھے مومو پر ترس نہیں آیا تھا۔

صارم ششدر کھڑا سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ "حسان! مجھے معاف کریں۔؟" صوفے پر بیٹھی مومو میرے قدموں میں آگئی، "میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی میں۔"

وہ رو رہی تھی، میں نے اپنے بھاری بوٹ سے اس کے چہرے پر ٹھوک ماری، وہ جیسے کو گر گئی۔

"غلطی؟ تم اسے غلطی کہتی ہو؟ تم سمجھتی رہیں یہ

بوڑھا ہو گیا ہے تو شاید بے غیرت بھی ہو گیا ہے، مگر میں بے غیرت نہیں ہوں۔"

"بس کریں حسان صاحب! چھوڑیں مرکو۔" میں اسے مارنے کو آگے بڑھا تو صارم نے بے اختیار مدخلت کی۔

"شٹ آپ صارم۔ تم جاؤ یہاں سے۔" مومو نے ایک دم چیخ کر اسے روکا۔ اس کے بڑھتے قدم دیں رک گئے۔

وہ اب صوفے کا سہارا لے کر انٹنے کی کوشش کر رہی تھی، میں نے اس کا بازو کھینچ کر اسے اٹھایا اور اس کا چہرہ اپنے بالکل سامنے کیا۔

"آٹھ سال تم مجھے دھوکا دیتی رہیں، کیوں؟ مجھے جواب دیا، "میں چیخ رہا تھا، اس نے ہونٹوں سے رستا خون تھیلی کی پشت سے صاف کیا اور کچھ کہنے کو لب کھولے۔

"مم۔۔۔ مم۔۔۔ میں۔۔۔" وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دوائی کی وہ شیشی نکال کر اس کے سامنے کی۔

"یہ کیا ہے، مہرانتا؟"

وہ جو کچھ کہنا چاہ رہی تھی، جیسے دو سو والٹ کا کرنٹ کھاکر دو قدم پیچھے ہٹی۔

اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی، اس کا پورا وجود یکا لمحے کو لرز رہا تھا۔

"یہ تم استعمال کرتی ہو نا، مومو؟" میں شیشی اس کے چہرے کے قریب لے جا کر پوچھ رہا تھا۔

وہ اسی طرح پھٹی پھٹی نگاہوں سے شیشی کو دیکھتی رہی۔

"مجھے جواب دو؟" میں حلق کے بل دھاڑا تھا۔

کچھ کہنے کے لیے کھلے لب اس نے بند کر کے زور سے آنکھیں میچ لیں، پھر انہیں کھول کر میری جانب دیکھا۔

اس لمحے میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ شاید وہ شیشی کسی اور کی ہو، مومو ڈاکٹر بھی، اس نے کسی کو دینی ہوگی، شاید میں بالکل غلط ہوں۔ کاش ایسا ہو جائے، کاش مومو کہہ دے کہ یہ کسی اور کی ہے۔

"مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ، مومو! یہ تم استعمال کرتی ہو؟"

اس نے بہت بے بسی سے میری جانب دیکھا اور پھر مومو نے، میری مومو نے اثبات میں سر ہلادیا۔

میں نے زور سے شیشی دیوار پر دے ماری۔ میرا ہ کچھ جل کر ختم ہو چکا تھا۔

"چلی جاؤ تم یہاں سے۔ دفع ہو جاؤ میرے گھر سے۔"

میں نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹا ہوا دروازے تک لے آیا۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے سے خون رس رہا تھا، چہرہ متورم اور آنکھیں سوچی ہوئی تھیں، وہ چپ خمی بالکل چپ۔

"میں نے تم سے محبت کی بے پناہ محبت مگر تم بد کردار عورت، تم نفسیاتی مریض۔ تم نے میرا مان توڑ دیا، مومو! نکل جاؤ میرے گھر سے، دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔" میں نے بیرونی دروازہ کھول کر اسے باہر دھکا دیا تھا۔

"نہیں۔" وہ ایک دم چیخی تھی۔ "یہ میرا گھر ہے، میں نہیں جاؤں گی۔" اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے، اس نے اپنی انگلیوں سے دروازے کی چوکھٹ تھام لی۔

"یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔" میں وحشیانہ انداز میں اسے باہر دھکیل رہا تھا، وہ میرے تھپڑوں کی تاب نہ لاتے ہوئے دیں زمین پر بیٹھتی چلی گئی، دروازے کا کنارہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

"میں آپ کی بیوی ہوں، مجھے ایک دفعہ۔" وہ روتے ہوئے کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔

"شٹ آپ۔" میں نے اسے اپنے بوٹ کی ایک اور ٹھوک ماری، "میرا اب تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

میں نے زور سے دروازہ بند کرنا چاہا۔ اس کی انگلیاں درمیان میں آکر چلی گئیں، ان سے خون نکل کر وہیں چوکھٹ پر گر رہا تھا۔

میں نے دروازہ کھول کر اس کے خون آلود ہاتھ وہاں سے ہٹانے چاہے۔ وہ دروازے کو پکڑے بیٹھی تھی جبکہ میں اسے دھکیل رہا تھا، اس کی پنک گھڑی اسی کھٹکھٹ میں بکھا گر گئی۔

"اس گھر سے اب تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دفع ہو جاؤ تم یہاں سے۔" اس کے ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں میرے اپنے ہاتھ خون آلود ہو چکے تھے۔

"نہیں۔ آپ ایسے نہیں کر سکتے۔ چونتیس برس کا غلطیوں ختم نہیں کر سکتے۔ حسان! آپ۔ نہیں۔" وہ دروازہ پکڑ کر رونے لگی تھی۔

"یہ خیال تمہیں اس وقت نہیں آیا جب تم میرے گھر کی میری ٹاک کے نیچے اپنے کزن کے فیئر چلا رہی تھیں؟ جب میری غیر موجودگی میں تم مجھ سے بے وفائی کر رہی

تھیں؟ تب تمہیں اس چونتیس برس کے تعلق کا خیال نہیں آیا؟" میں بھڑک اٹھا تھا۔

ایک دم مومو نے دروازے کی دہلیز چھوڑ دی، وہ صرف اور صرف مجھے دیکھ رہی تھی، اس کی نگاہیں جیسے پتھر کی ہو گئی تھیں۔ وہ بالکل ساکت ہو چکی تھی۔

"کیا کہا آپ نے؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا تھا۔

"تم کیا سمجھتی تھیں، مجھے پتا نہیں چلے گا؟ تم میرے گھر میں ایک غیر مومو کے ساتھ فیئر چلاتی رہو گی، اور میں میں بڑھا اور بے غیرت بن کے تماشا دیکھا رہوں گا؟ تم جھوٹی بد کردار، ذلیل عورت۔" ہوتے بولتے میرا سانس پھول گیا تھا۔

اسی لمحے مومو زمین سے اٹھ کھڑی ہوئی، اس کی انگلیوں سے خون رس رہا تھا، مگر اس کو درد نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی، میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"میں جھوٹی ہوں؟ میں بد کردار ہوں؟ ہاں میں جھوٹی اور بد کردار ہوں، میں آپ کے گھر میں اپنے کزن کے ساتھ فیئر چلاتی رہی ہوں۔ ہاں میں بہت بری ہوں۔ ایک دفعہ آپ نے کہا تھا، تم نادان ہو۔ پایا نے بھی یہی کہا تھا، آپ دونوں نے درست کہا تھا۔ ہاں میں نادان تھی، یا گلی تھی، بے وقوف تھی، جو چونتیس برس آپ سے محبت کرتی رہی۔"

وہ مجھے دیکھتے ہوئے پیچھے ہٹی، صارم تو پہلے ہی باہر جا چکا تھا۔

"میں۔۔۔" اس سے آگے بولنے کی بہت مومو میں نہیں رہی۔ وہ کب لڑائی جھگڑوں میں بولا کرتی تھی، لب بھینچ کر وہ اپنے خون آلود ہاتھ لیے بھاگتی ہوئی صارم کے پاس چلی گئی، میں نے دروازہ بند کر دیا۔

میاں بیوی کے درمیان اصل رشتہ اعتبار اور اعتماد کا ہی تو ہوتا ہے۔ ہمارے درمیان وہ دونوں ختم ہو چکے تھے۔

میری مومو اپنی بد کرداری، اپنے جھوٹ کا اقرار کر کے میرے گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

مومو ایک دفعہ پھر میری زندگی سے چلی گئی تو میں زندگی کو آٹھ برس پہلے کی اسٹیج پر لے آیا۔ فرق صرف یہی تھا کہ اب مجھے مومو کا انتقام نہیں تھا۔ اسی لیے میں نے آرٹ اکیڈمی بند کر دی اور اپنا خراج صرف یونیورسٹی سے چلانے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیش کش

(WWW.PAKSOCIETY.COM)

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے آپ کیلئے پیش کیا۔

ہم خاص کیوں ہیں؟؟؟؟

یہ واحد ویب سائٹ ہے جہاں سے تمام مہتمم ڈائجسٹ، ناول، عمران سیریز، شاعری کی کتابیں، بچوں کی کہانیاں، اور اسلامی کتابیں

ڈائریکٹ ڈاؤن لوڈ کرنے کے ساتھ ساتھ آن لائن پڑھ بھی سکتے ہیں۔



fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

اگر آپ کو ویب سائٹ پسند آئی ہے تو پوسٹ کے آخر میں اپنا تبصرہ ضرور دیں۔

اپنا تبصرہ صرف پوسٹ تک محدود رکھیں۔ درخواست کے لئے رابطہ کا صفحہ استعمال کریں۔

اپنے دوست احباب کو بھی پاک سوسائٹی کے بارے میں بتائیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی انتظامیہ سے مالی تعاون کیجئے۔ تاکہ یہ منفرد ویب

سائٹ آپ کیلئے جاری رکھی جاسکے۔

پاکستانیوں کے ویب سائٹ

WWW.Paksociety.Com



Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

ٹورنٹو کے ماں پر آیا ہوں۔

مال کے ایک قدرے مہنگے سے اسٹور سے کچھ شاپنگ کرنے کے لیے میں وہاں گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں ٹورنٹو کی سڑکوں میں پھرتے ہوئے مجھے لگتا تھا کہ میں سرراہ مومو سے ٹکرا جاؤں گا۔ وہ رہتی بھی ڈاؤن ٹاؤن کے قریب ہی تھی۔ اگر اس نے الگ گھر لے لیا ہو تو الگ بات تھی مگر یہیں کا گھر بیس آس پاس ہی ہوتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ مومو صارف کے ساتھ چلی آئی تھی۔

ایک گارمنٹس شاپ سے لیدر جیکٹ پسند کرتے ہوئے میں مسلسل اطراف میں دیکھ رہا تھا مگر وہاں مومو کہیں نہیں تھی۔ بالآخر میں اپنی جیکٹ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

جس لمحے میں کاؤنٹر پر کھڑا بے منت کر رہا تھا مجھے اپنے دائیں جانب ایک شناسا چہرہ دکھائی دیا۔

وہ مومو نہیں تھی وہ صارف تھا۔

وہ بھی اپنے لیے جیکٹ پسند کر رہا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ بڑا اور ہینڈ سم ہو گیا تھا۔ اس نے چھوٹی سی واٹر می بطور فیشن رکھی ہوئی تھی۔ اس کا قد اور بھی لمبا بھی ہو گیا تھا۔ کتنے ہی لمحے میں صارف کو دیکھتا رہا وہ چیونٹم چبانے ہوئے جیکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔ اور وہ لڑکی مومو نہیں تھی۔

وہ شکل سے ایشین لگتی تھی مگر شاید پلی بڑھی وہیں تھی۔ مجھے بہرحال صارف کو کسی اور لڑکی کے ساتھ دیکھ کر جھٹکا لگا تھا۔

جیکٹ کی بے منت کر کے صارف اپنا اشار تھاے کسی بات پر ہنستے ہوئے اس لڑکی کے ہمراہ باہر نکلنے ہی لگا تھا کہ دفعتاً اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔

اس کی ہسی رک گئی صرف ایک لمحہ لگا تھا اسے مجھے پہچاننے میں پھر اس نے منہ پھیر لیا۔

”صارف!“ اپنی انا، عزت نفس کو پس پشت ڈال کر میں نے اسے پکارا تھا۔

اس نے چہرہ میری جانب کیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تڑپ آ گیا تھا۔

”ہیس۔“ اس نے یوں مخاطب کیا جیسے ہم اجنبی ہوں۔ میں ایک قدم آگے بڑھا۔ ”مجھے تم سے بات کرنا

لگا۔ وہ گئی تو میرا گھر ایک دفعہ پھر دربان ہو گیا۔ میری ہر شے بے ترتیب ہو گئی، کوئی چیز بھی نہیں ملتی تھی۔ میں نے بالآخر ایک لڑکے کو ملازم رکھ لیا۔

اس ملازم لڑکے نیل کو میں نے کہہ رکھا تھا کہ وہ مجھے ناشتے میں تلا ہوا انڈا اور کافی نہیں دے گا نہ ہی وہ لوٹنگ روم میں ان ڈور پلائس رکھے گا۔ مومو کے تمام پودے میں نے اپنے گھر سے باہر نکال دیے تھے۔

جس صبح وہ میرے گھر سے گئی تھی اسی شام میں نے اس کا تمام سامان کپڑے، جوتے، پاسپورٹ وغیرہ بیک میں ڈال کر حیدر کے گھر پہنچا دیا تھا۔ یہ کام میں نے خود نہیں کیا تھا بلکہ ایک ملازم کی مدد لی تھی۔

ہر روز صفائی کرتے وقت نیل دروازے کی چوکھٹ پر لگے سیاہی مائل سرخ دھبوں کو صاف کرنے کی ٹاکام کوشش کرتا تھا۔ وہ دھبے صاف نہیں ہوتے تھے۔ مومو اپنی یادیں میرے گھر میں بکھیر کر چلی گئی تھی۔

تو یہ بھی میری کہانی۔ ایک بے وفاماں سے شروع ہو کر بے وفائی پر ختم ہونے والی داستان۔

میں نے آپ سے کہا تھا میں آپ کو کوئی افسانوی قسم کی happy ending (خوشگوار اختتام) نہیں دے پاؤں گا۔ آپ کو چند کڑے حقائق اپنے حلق سے نیچے اتارنے پڑیں گے۔

تو یہ میری کہانی کا اختتام تھا۔ اگر میں کوئی رائٹر ہوتا تو اپنی اور مومو کی کہانی میں ختم کر ڈالتا کیونکہ رائٹر کے پوائنٹ آف ویو سے آگے کچھ بچانا تھا۔

لیکن۔

میری داستان ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ابھی کچھ باقی ہے وہ ”کچھ“ جس کے لیے میں آپ کو یہ کہانی سناتا تھا۔

مومو کے جانے کے چار ساڑھے چار برس بعد یعنی کل شام میں کینڈا آیا ہوں۔

مجھے یہاں ایک دنیائے آرٹ کے سینار میں شرکت کرنا تھی ایک جگہ۔ پچھر دہا تھا اور بس میری کل صبح واپسی ہے۔

کل کی پوری شام سینار میں گزر گئی، آج کی صبح یونیورسٹی میں اور بالآخر میں بھی لحد پہلے فائبر ہو کر

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

مران ڈائجسٹ

اگست 2008 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

Email: id@khawateendigest.com

☆ "آتش زاوہ" ایک نوجوان کی حیرت انگیز داستان جو بھی ہی عمر میں ہی دشمنوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ پرتشخص سلسلہ

☆ "اندھیری مسافتیں" معاشرتی برائیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے والے ایک نوجوان کی مٹا مٹا خیر داستان، ایم اے راحت کے قلم سے،

☆ "آشیانہ" آخری صفحات پر ایم اے راحت کی معاشرتی تحریر

☆ "شیطان کے گماشتے" اسلام راہی کے قلم سے تاریخ کے اوراق،

☆ ملکی و غیر ملکی ادب سے انتخاب،

☆ زندگی کے تلخ حقائق سے منتخب "بچی داستانیں"۔

ادب کے وہ بہترین ڈائجسٹ

تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

تجربہ صرف آپ! آپ نے ان کو دھتکارا تھا۔ نتیجتاً انہوں نے صرف آپ کو دکھ دینے کے لیے کینیڈا جاتے ہی بین آنٹی کے دیور سے شادی کر لی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ اپنے شوہر کے ساتھ وطن واپس آئیں اور آپ کو یہ سب کچھ بتا کر دکھ دیں۔ مگر ان کی شادی دو ماہ ہی چل سکی تھی۔ بین آنٹی کے دیور یعنی میرے نادر کا دو ماہ بعد ہی ایک سیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔

جب سترہ سال کی عمر میں مہراں میں تو انہیں لگا انہوں نے غلطی کر ڈالی ہے۔ وہ مجھے بین آنٹی کے حوالے کر کے پاکستان چلی گئیں۔ ان کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ امید باقی تھی کہ آپ ایک نہ ایک دن ان کی محبت کا یقین کر کے ان سے شادی کر لیں گے، یہی امید اور یہی خواہش تھی جس نے ان سے جھوٹ بلوایا۔ یہاں کسی کو ان کی شادی کا علم نہیں تھا۔ بین آنٹی نے سب سے چھپا لیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں مہر کی شادی ہو جائے اس لیے یہ بات مشرقی پوائنٹ آف دیو سے چھپانا ضروری تھی کہ وہ ایک بیوہ اور ایک بچے کی ماں بھی ہیں اور آپ سے چھپانا تو اور بھی ضروری تھا۔ وہ کہتی تھیں۔

"میں نے حسان سے اس لیے چھپایا کہ وہ شخص تو باسی کھانا نہیں کھاتا تھا، کسی دوسرے کے استعمال شدہ تو لیے کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا، وہ بھلا کسی کی بیوہ کو کہاں قبول کرے گا؟"

میرے نزدیک یہ ان کی غلطی تھی۔ لیکن غلطی انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔ وہ کوئی ریفیکٹ قسم کا افسانوی کردار نہیں تھیں، وہ ایک جیتی جاگتی انسان تھیں۔ ان سے بھی حماقت ہوئی تھی اور اس حماقت کا ثبوت میں تھا۔

سترہ برس میں کینیڈا میں بین آنٹی کے پاس بلا بڑھا، سترہ برس میں ماں کی محبت کو ترسا۔ میری ماں اپنا گھر بنانے کے لیے مجھے چھوڑ گئی تھی، بائیکل ایسے جیسے آپ کی ماں آپ کو چھوڑ گئی تھی۔ مگر میں نے حسان رضا کی طرح اپنی ماں کو بے وفا نہیں قرار دیا، میں ان کی مجبوری کو سمجھتا تھا۔ انہوں نے آپ سے ایک جھوٹ بولا اور اسے چھپانے کے لیے اور بھی کتنے جھوٹ بولے۔

وہ بہت سچے اور حساس دل کی مالک تھیں، انہوں نے اپنے بچے کو اس کا حق نہیں دیا تھا۔ وہ محبت نہیں دی تھی جس کا وہ حق دار تھا اس لیے ان کے دل میں احساسِ جرم تھا۔ وہ جب بھی کسی بچے کو دیکھتی تھیں۔ یہ احساسِ جرم انہیں بڑی طرح ڈنڈا کرتا تھا۔ پھر وہ دوسرا بچہ کیسے پیدا

"حسان صاحب! آپ نے میرے "صرف" محبت کی تھی اور محبت "صرف" نہیں ہوا کرتی محبت اعتبار اور اعتماد کے بنا دھوری ہوتی ہے۔ آپ نے جو تیس برس میرے محبت کی، مگر اعتبار نہیں کیا بلکہ آپ نے تو شاید ان سے محبت بھی نہیں کی، آپ کو صرف ان کی ضرورت تھی۔ محبت تو صرف آپ نے اپنے آپ سے کی ہے۔ آپ ایک خود غرض، سیلف سینٹرڈ اور خود پسند انسان ہیں۔ آپ کو ہمیشہ سے اپنا مفاد عزیز رہا ہے۔ اور مہر صاحب! آپ جو تیس برس اس عورت کو نہ سمجھ سکے؟ آپ جانتے ہیں مہر کون تھیں؟ آپ نہیں جانتے، آپ تو کچھ بھی نہیں جانتے۔ میں آپ کو بتانا ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں سرخی تھی، کرب تھا۔ اس کی آواز سے میرے لیے نفرت چھلک رہی تھی۔

"میں آپ کو بتاتا ہوں حسان صاحب! مہر کون تھیں وہ عورت جسے آپ نے بے عزت کر کے دھکے دے کر مجھ سے افسوس چلانے کے الزام میں گھر سے نکالا تھا وہ عورت حسان صاحب۔ وہ عورت میری ماں تھی۔ میری سگی ماں!"

مجھ پر کسی نے آسمان توڑا تھا، میں جیسے کرنٹ کھا کر قدم پیچھے ہٹا۔ "نہیں... نہیں..." میں نے بے یقینی سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ غلط کہہ رہا تھا، مومو کیسے اس کی ماں نہیں ہے۔

"یقین نہیں آیا نا آپ کو؟ کیسے یقین آسکتا ہے آپ کو؟ آپ تو اپنے شک میں بہت دور تک نکل چکے ہیں۔ آپ تو میرے اور ان کے تعلق کو ہماری محبت کو اس گندی نظر سے دیکھتے رہے جس کے بارے میں مجھے سوچتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔"

مجھے لگا صارم رو رہا ہے۔ اس کی آواز بھیگ چکی تھی۔

"میری ماں نے زندگی میں صرف ایک غلطی کی تھی، میرے نزدیک یہ غلطی نہیں تھی مگر ان کے نزدیک تھی۔ جس دن آپ نے ان کو رلایا تھا ان کی عزت نفس کو کچا تھا اس دن انہوں نے روتے ہوئے اپنے پیاسے کہا تھا کہ اگر حسان نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں اپنی مرضی سے کسی سے بھی شادی کر کے خود کو برباد کر ڈالوں گی، شاید تب "سر" کو دکھ ہوا اور انہیں میرا خیال آئے۔ یہی پریشانی میرے نانا کی موت کا سبب بنی تھی اور اس کی وجہ بھی آپ

ہے۔"

میں نے چونکہ انگریزی میں کہا تھا، اسی لیے اس کے ساتھ موجود لڑکی "اوکے" میں تمہارا باہر دھت کر رہی ہوں، "کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔"

صارم نے شوفر سے مجھے دیکھا۔ "جی۔ کیا بات کرنی ہے آپ کو؟" اس کا انداز اکھڑا اکھڑا سا تھا۔

"میں مومو کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ کیسی ہے؟" ہم دونوں ایک ساتھ شاپ سے باہر نکلے تھے۔ وہ میری جانب دیکھنے کے بجائے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"کیسا ہونا چاہیے؟" اس نے النابجھ سے پوچھا۔ ہم دونوں روڈ کے کنارے پر کھڑے تھے۔

"شادی کر لی اس نے؟ شاید نہیں کی، کیونکہ تمہارے ساتھ تو کوئی اور لڑکی ہے۔" میں نے طنز کیا۔

اس نے چہرہ میری جانب کیا۔ "وہ میری منگیتر ہے، نہیں۔"

"زبردست صارم، بہت اچھا۔ میرا گھر برباد کر کے تم نے منگنی رچالی کسی اور سے؟ تمہارے لیے مومو نے مجھے چھوڑا اور تمہیں! مجھے اس پر شدید غصہ آیا تھا۔"

"سب سے پہلے تو حسان صاحب آپ اپنی یہ غلط فہمی دور کر لیں میرے آپ کو چھوڑا تھا۔ انہوں نے آپ کو چھوڑا نہیں تھا، آپ نے ان کو گھر سے دھکے دے کر نکالا تھا۔ اور دوسری بات۔ وہ سرد اور کشیلے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"مجھے اپنے گھر کی بربادی کا ذمہ دار نہ سرائیں۔ آپ نے خود اپنا گھر برباد کیا تھا۔"

"میں نے؟" میں نے بے یقینی سے اپنی جانب اشارہ کیا۔ "میں نے اپنا گھر برباد کیا تھا یا تم نے؟"

"آپ نے۔ آپ نے اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر کو آگ لگائی تھی۔" وہ بڑے سکون سے کہہ رہا تھا۔

"اور تمہارا کوئی دوش نہیں؟"

اس نے ایک جھٹکے سے میری جانب دیکھا، "کیوں؟"

میں نے کیا کیا ہے؟

"تم نے میری بیوی کے ساتھ میرے گھر میں افسوس چلایا، صارم! تمہیں میری اس بیوی کو مجھ سے چھین لیا جس سے میں نے جو تیس برس محبت کی تھی۔ اور تم کہتے ہوئے ہم نے کیا کیا؟" شدت ضبط سے میری آواز کپکپا رہی تھی۔

کر سکتی تھیں۔ مگر قدرت نے محبت سے تخلیق کیا تھا۔ انہوں نے اپنے ہر رشتہ کو پوری محبت اور خیال سے نبھایا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو بھول جائیں۔ وہ اپنی پہلی شادی کو بھی اپنی غلطی سمجھتی تھیں احساس جرم اور آپ سے محبت کی اس کشمکش میں وہ دوسرا بچہ پیدا نہیں کرنا چاہتی تھیں اور شاید اپنے بچے کو ممتا سے محروم رکھنے کے جرم میں وہ خود کو سزا دے رہی تھیں۔ پھر انہیں یہ خدشہ بھی ستا تھا دوبارہ ماں بننے کے عمل میں کہیں یہ راز نہ کھل جائے کہ وہ پہلے بھی ماں بن چکی ہیں۔ اگرچہ بہین آئی انہیں بہت سمجھانی تھیں لیکن میری ماں کے دل میں ڈر تھا، خوف تھا اس محبت کے کھوجانے کا خوف جو اس نے بہت کڑی ریاضت کے بعد پائی تھی ماں میری ماں ڈرتی بہت تھی۔ صرف اسی ڈر خوف کے پیچھے، صرف اپنا گھر بچانے کی خاطر انہوں نے اپنی ماستا قربان کر ڈالی۔ انہوں نے مجھے خود سے دور رکھا۔

وہ وہیں گھاس پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ رو رہا تھا وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

”سترہ برس میں ماں باپ کے اپنے تائی کے پاس پلٹا رہا، سترہ برس میں اپنی ماں گویا دکر کے رو تا رہا اور وہ بھی پرسکون نہیں تھیں۔ وہ ہر دوسرے بچے میں اپنا صارم ڈھونڈتی تھیں وہ صارم جسے وہ دوتا، بلکاتا اور نوٹ میں چھوڑ کر نکلتی تھیں۔ صرف اور صرف آپ کی خاطر۔ آپ کی وجہ سے میں سترہ برس اپنی ماں سے دور رہا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ آپ کی محبت انہیں صارم کو اپنے بیٹے کو بھولنے پر مجبور کر دے گی مگر ماں کی ممتا کوئی نعم الہی نہیں ہوا کرتا، وہ آپ کی محبت کے باوجود اپنی ممتا کے آگے ہار گئی تھیں۔“

صارم نے اپنا سر لب بوسٹ کے ڈنڈے سے ٹکادیا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہ رہے تھے۔

”پھر انہوں نے مجھے بلوایا۔ سترہ برس بعد صرف اور صرف ایک ماہ کے لیے میں ان سے ملنے آیا۔ وہ میں پنتیس دن ان کی زندگی کے خوشگوار ترین دن تھے ان کا جوان بیٹا جو ان کے کندھے سے بھی اونچا تھا ان کے پاس آیا تھا۔ وہ کیوں نہ خوش ہوتیں؟

چونتیس برس انہوں نے آپ کی خدمت کی حسان صاحبہ اور پھر چونتیس برس بعد صرف چونتیس دن اپنے بیٹے کو پیار دینا چاہا، مگر آپ اتنے تنگ دل، خود غرض اور گھٹیا انسان تھے، آپ نے اس پر بھی شک کیا۔ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے بعد جس تیسری

محبت کو اس دنیا کی سب سے عظیم اور خالص محبت کہا جائے ہے، جس نے اللہ اپنی محبت کا موازنہ کرتا ہے، آپ نے اس محبت پر بھی شک کیا۔

صرف آپ کی وجہ سے میں ان کو بھی ”ماں“ نہیں کہہ سکا۔ صرف آپ کی وجہ سے میں سترہ برس محرومیوں میں گھرا رہا۔ سترہ برس بعد مجھے میری ماں ملی تھی، مگر آپ نے کیا کیا؟ سب کچھ تباہ کر ڈالا۔“

وہ سر گھٹنوں پر رکھ کر ہچکیوں سے رو رہا تھا اور میں۔ میں۔ ساکت سا کھڑا اس اونچے لمبے لڑکے کو روتے دیکھ رہا تھا۔ میرے جسم سے کوئی آہستہ آہستہ جان نکال رہا تھا۔

”مومو نے۔۔۔ کیوں نہیں بتایا یہ سب مجھے؟ صرف۔ صرف ایک بار تو اعتبار کیا ہوتا مجھ پر ایک بار تو کہا ہوتا کہ اس کا بیٹا بھی ہے، کیا تب میں اس کے بیٹے کو اپنا بیٹا سمجھ کر نہ پاتا؟“ میری آواز دور کہیں کسی کھالی سے آتی سنائی دے رہی تھی۔

”ہاں“ صارم نے تنفر سے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ”میں نے بھی یہی کہا تھا ان سے، جب آپ نے ان کو نکال دیا تھا۔“

اور جانتے ہیں، انہوں نے آگے سے کیا کہا؟ انہوں نے کہا۔ ”صارم! کم نہ بھی ہوتے تب بھی حسان مجھے مجرم ثابت کر ہی دیتے، میں انہیں اپنے پہلے شوہر کا بیٹا ہی تو نہ اٹھتے بیٹھتے اس کے نام کے طعنے دیتے میں سوچ میں کم ہوتی تو وہ مجھ پر اپنے سابقہ شوہر کو یاد کرنے کا شک کرتے۔ شک اس آدمی کی رگ رگ میں بھرا ہے۔“ اور آپ کہتے ہیں، وہ آپ پر اعتبار کرتیں؟ انہوں نے تو آپ پر بہت اعتبار کیا تھا، بس آپ نے ان پر نہیں کیا تھا۔

جس دن آپ نے ان کو اپنے گھر سے نکل دیا، اس رات وہ میرے کندھے سے لگ کر بہت روئی تھیں اور میں۔ میں ان کے ساتھ رویا تھا۔ وہ بار بار مجھ سے کہتی تھیں۔

”صارم! مجھے جگادو میں نے شاید کوئی خواب دیکھا ہے۔“ وہ اپنے چہرے پر ہاتھ لگا کر روتی تھیں۔

”صارم! حسان نے میرے منہ پر لوٹ مارا۔“ وہ اپنے زخمی ہاتھ دیکھ کر روئی تھیں۔ ”انہوں نے میرے ہاتھ دروازے میں کچل ڈالے۔ وہ تو میرے آرنسٹک ہاتھوں سے بہت محبت کرتے تھے مجھے کاٹا بھی چبھ جاتا، تو تکلیف انہیں ہوتی تھی۔ پھر انہوں نے

کیا کر دیا۔“

اس رات میری ماں بہت روئی تھی، اور اس رات مجھے پہلی بار آپ سے بے حد نفرت محسوس ہوئی تھی۔ میرا دل آپ کو قتل کرنے کو چاہتا تھا۔“

صارم روتے ہوئے، بچوں کی طرح روتے ہوئے کہہ رہا تھا، اور کوئی مجھے دودھاری ٹکڑا سے ذبح کر رہا تھا۔

یہ میں نے کیا کر ڈالا؟ میرے خدا۔! یہ میں نے کیا کر ڈالا؟

میں نے اپنی مومو کو اپنے گھر سے نکال دیا؟ اس مومو کو جس کے لیے میں کتابیں لاتا تھا، جس کے ساتھ میں کافی بیٹا تھا، جس کے رنگوں اور تیلیوں سے میں محبت کرتا تھا۔ میرے اللہ! میں نے اس مڑی ہوئی پلکوں والی لڑکی کے ساتھ کیا کر ڈالا؟

سترہ برس بعد اسے اس کا بیٹا ملا تھا، اور میں نے اس کو کیا سزا دے ڈالی؟ میں نے اس کے چہرے پر اپنا بھاری جوتا مارا، وہ جو اس کی پلکوں سے بھی تولگا ہو گا، اس کی ان پلکوں سے جن سے مجھے محبت تھی۔

میں نے اس کے ہاتھ لہو لہان کر ڈالے، وہ ہاتھ جن کو میں دنیا کے خوبصورت ترین ہاتھ کہا کرتا تھا۔ میں نے اس کو ایک دفعہ پھر رولایا، یہ کیا کر دیا میں نے؟

اپنی خود ساختہ تھیوریوں میں، اپنی فضول سوچوں سے میں نے اپنے آئین کو جلا ڈالا؟ یہ کیا کر دیا میں نے؟

”آپ نے مجھ سے میری ماں چھین لی حسان صاحب! اب آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟“

وہ سرخ، گلی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ میں اسے کیا جواب دیتا، میرے پاس کہنے کو کچھ بھی تو نہیں تھا۔

”صارم! مجھے اپنی ماں کے پاس لے چلو۔ میں۔ میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔۔۔ وہ مجھ سے۔۔۔ عیاض نہیں ہو سکتی۔۔۔ وہ کبھی مجھ پر ناراض نہیں ہوتی۔“

میں گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا تھا۔ میرے ہاتھ صارم کے آگے جڑے تھے۔

”سوری حسان صاحب! اب آپ کو دیر ہو چکی ہے۔ اب آپ کو روزِ حشر اپنے کیے کا جواب دینا ہو گا۔ میری ماں دو سال پہلے تھانی راز گلینڈ کے کینسر سے مر گئی۔ آپریشن کے دوران ان کی تھانی راز کے پیچھے والی رگ کٹ گئی تھی، نہ بھی کٹتی تو بھی اندر سے تو آپ نے انہیں مار ہی ڈالا

تھا۔“

اس نے بے حد نفرت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی۔ ”آپ جو خود کو بہت ذہین سمجھتے تھے، ایک ماں کی محبت کو نہ پہچان سکے، مگر آپ بھی کیسے پہچانتے، آپ نے ماں کی محبت دیکھی کب تھی؟“

میں گھٹنوں کے بل گھاس پر بیٹھا ہوں، اور صارم۔ صارم جا چکا ہے۔

میں یہی بتانا چاہتا تھا آپ کو۔ مجھے میرا علم مجھے دھوکا دے گیا تھا۔ کتابوں میں لکھی ساری باتیں سچ نہیں ہوتیں۔ صرف علم کا سارا بہت کمزور سارا ہوتا ہے۔ کتابوں میں جو تھیوریاں ہوتی ہیں۔ انہیں جیتے جاگتے انسانوں پر ایلائی کرنا کتنا غلط ہوتا ہے۔ ہم ایک جہاں کا علم حاصل کر لیتے ہیں۔ دنیا بھر کی کتابیں پڑھ لیتے ہیں لیکن ایک انسان کو نہیں جان پاتے اسے نہیں سمجھ پاتے۔

میں یہی بتانا چاہتا تھا آپ کو کہ اس دنیا میں فلسفی اور افسانوی روئیں بھری جذباتی کشش جسے آپ اور میرے جیسے لوگ محبت کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ایک محبت ہوتی ہے۔ وہ محبت جس کا مقام اس دنیا کے تمام رشتوں میں پانی جانے والی محبت سے ارفع ہے، وہ محبت ماں کی محبت ہوتی ہے اور میں وہ بد قسمت انسان ہوں جو کسی بھی محبت کو نہیں پہچان سکا۔ پہچانتا بھی کیسے ماں کی محبت تو دیکھی ہی نہیں تھی، تھیوریوں پر یقین کر کے میں مومو کی محبت پر بھی یقین نہیں کرتا تھا۔

اور اب۔ صارم میرے پاس سے جا چکا ہے، جاتے ہوئے وہ کہہ کر گیا ہے کہ جس مومو کے بارے میں آپ کو فخر تھا کہ وہ آپ کے پکارنے سے پہلے ہی آجاتی تھی، آج آپ اس کو جتنا پکاریں گے، وہ نہیں آئے گی۔

میری مومو، کبھی اسی بیماری سے مر گئی، جس سے کئی برس پہلے ایک اور مومو مر گئی تھی۔

میں جس نے کبھی مومو کو نہیں منایا، آج نور نو کی اس مصروف سڑک کے کنارے، گھاس پر گھٹنوں کے بل بیٹھا یہ سوچ رہا ہوں کہ میں اس لڑکی کو کیسے سمجھتا تھا۔ جس سے میں نے چونتیس برس محبت کی؟

میں اپنی مومو، حیدر کی مہر النساء، نور صارم کی مہر کو کیسے پکاروں؟ اسے کہاں ڈھونڈوں؟